بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تحریک ادب
شمارہ اکتوبر-2024 جلد نمبر 17
Tahreek-e-adab vol-17, issue-82 October 2024

Editor مدیر
Jawed Anwar (Dr.Jawed Ahmad) جاوید انور (ڈاکٹر جاوید احمد)
cell-0091-9935957330

مجلس ادارت
Editorial board and Peer Review committee
پروفیسر صغیر افراہیم، سابق صدر شعبہء اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
Prof. Sagheer Afrahim Ex.Chairman Dept.of Urdu A.M.U.
پروفیسر شہاب عنایت ملک، سابق صدر شعبہء اردو، جموں یونیورسٹی
Prof.Shohab Inayat Malik HOD Urdu,Jammu University
ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبہء عربی، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی
Dr. Shams Kamal Anjum, H.O.D. Arabic, Baba Ghulam Shah Badshah University,Rajouri (J&K)
پروفیسر محفوظہ جان، صدر، شعبہء کشمیری، کشمیر یونیورسٹی
Prof. Mahfooza Jaan(H.O.D.Kashmiri,Kashmir University)
پروفیسر شاہینہ رضوی (سابق صدر، شعبہء اردو، مہاتما گاندھی کاشی ودیاپیٹھ یونیورسٹی، وارانسی)
Prof.Shahina Rizvi(Ex.HOD,Urdu,MKVP University,VNS.)
ڈاکٹر دبیر احمد، صدر شعبہء اردو، مولانا آزاد پی۔جی۔کالج، کولکاتا
Dr. Dabeer Ahmad,H.O.D.Urdu, Maulana Azad P.G. College,Kolkata
ڈاکٹر احسان حسن، شعبہء اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
Dr.Ehasan Hasan,Dept of Urdu BHU Varanasi

مجلس مشاورت

Advisery Board and Peer Review committee

نجمہ عثمان، پروفیسر عارفہ بشریٰ، رشید احمد،

عرفان عارف، ڈاکٹر چمن لال

Najma Usman (Surrey, United Kingdom)

Prof. Arifa Bushra (Dept. of Urdu,Kashmir University)

Rasheed Ahmad (Chairman Rosewood Academy,VNS)

Ishtiyaq Ahmad (General Secretary, Sir syed society Varanasi)

Irfan Arif (H.O.D.Dept. of Urdu,GDC Reasi University of Jammu,

Dr.Chaman Lal Bhagat (Asst. Prof.Dept. of Urdu,Jammu University,Jammu)

Name Tahreek-e-Adab(Urdu Monthly)

ISSN 2322-0341

Vol-17 (جلد نمبر 17) Year of Publication 2024 سال اشاعت:

Issue October 2024، شمارہ 82۔اکتوبر، شمارہ نمبر

Title name Artist : Anwar Jamal, Varanasi سرنامہ خطاط: انور جمال

Title cover Uzma Screen, Varanasi عظمیٰ اسکرین : سرورق

200/-Two Hundred rs. per copy دوسو روپے : فی شمارہ

زرسالانہ : دو ہزار روپے (رسالہ صرف رجسٹرڈ ڈاک سے ہی بھیجا جائے گا)

Annual Membership 2000/- rs. two Thousand Rupees

تاعمر خریداری (ہند): بیس ہزار روپے

Life Time: 20000/- Twenty Thousand rs.(only india)

چیک یا ڈرافٹ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے ذریعے زر رفاقت یہاں ارسال کریں۔

Please send your subscription amount or donation through cheque,draft or internet banking on the following:

Jawed Ahmad IFSC SBIN0005382 A/C no. 33803738087 State Bank Of India,Branch-Shopping centre(B.H.U.Campus.B.H.U.Varanasi-221005(U.P) India

اس شمارہ کی مشمولات میں اظہار کیے گئے خیالات ونظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

The content/idea expressed in any article of this journal is the sole responsibility of the concerned writer and this institution has nothing to do with it.

متنازعہ تحریر کے لیے صاحب قلم خود ذمہ دار ہے۔تحریک ادب سے متعلق کوئی بھی قانون چارہ جوئی صرف وارنسی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

Any legal matter pertaining to tahreek-e-adab will be possible only in the jurisdiction of Varanasi court.

جاوید انور مدیر تحریک ادب نے نیہا پرنٹنگ پریس، وارانسی سے شائع کرار دو آشیانہ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈواڈیہہ بازار، وارانسی سے تقسیم کیا۔

Jawed Anwar Editor Tahreek-e-Adab has got this journal published from Neha Printing Press, Varanasi and distribute it from Urdu Ashiana,167 Afaq Khan Ka Ahata,Manduadeeh Bazar,Varanasi-221103

فہرست

1۔عرفات میں حاضری، مزدلفہ میں قیام (کتاب دل) نجمہ عثمان 5
2۔کلیگ کے فرشتے، دل کا حال سنے دل والا،
رہے نام سائیں کا (میں زندہ آدمی ہوں) خالد حسین 16

نعت، نظمیں:
یعقوب تصور، پروین شیر، اسلم عمادی، ڈاکٹر ثروت زہرہ، خالد جمال 51

مضامین:
1۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور مواصلاتی مہارت ڈاکٹر سید توقیر امام 56
2۔طارق شبنم: بے سمت قافلے کا رہبر ایس معشوق احمد 64
3۔لداخ میں اسکولی تعلیم کا منظر نامہ: پیش رفت اور مسائل فاطمہ زہرا 67
4۔رواج زبان فارسی در کشمیر در قرون چہار دھم و پانزدھم ڈاکٹر اختر حسین شاہ 71

غزلیں: رفیق راز، سہیل اقبال، ڈاکٹر رفیق انجم 80

کالم: شہرت بیگ کی ڈائری عارف نقوی 84

ایک سچا خواب: ذکی شیرازی سے ملاقات عارف نقوی 88

افسانے:
1۔یہ سچ ہے پروفیسر شاہینہ رضوی 96
2۔آرزو نور شاہ 99
3۔پانچ وحشی سعید 103

Arafat mein Hazri & Muzdalefa mein qayam (Kitab-e-dil) by Najma Usman (Surrey, U.K) cell-0044-7936-9117-11

نجمہ عثمان (سرے، یو کے)

عرفات میں حاضری

صبح نماز اور ناشتے کے بعد ہم لوگ کوچ میں بٹھا دیے گیے۔ راستہ زیادہ لمبا نہیں تھا ۔تمام زائرین نے' لبیک اللھم لبیک' کا ورد شروع کر دیا۔ ہمارے گروپ میں زیادہ تر بنگالی خاندان تھے۔ایک صاحب کی بڑی پاٹ دار آواز تھی وہ جب ''لبیک ۔۔'' با آواز بلند ایک خاص لے میں پڑھتے تو تمام لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے ۔کیونکہ ان کی آواز لاؤڈ اسپیکر سے کم نہیں تھی۔کوچوں کے تمام سفروں میں ان کا یہی انداز رہا۔جھوم جھوم کے پڑھتے اور دوسروں کو بھی اس میں شامل کر لیتے۔

عرفات زیادہ دور نہیں تھا لیکن کوچوں کی ایک لمبی قطار تھی اور پیدل چلنے والوں کی تعداد کا تو شمار ہی نہیں تھا۔آگے پیچھے دائیں بائیں زائرین کے سَر ہی سَر نظر آ رہے تھے۔میرے تصور میں نہ جانے کیوں تھا کہ عرفات ایک چٹیل میدان ہوگا جہاں سوائے ریت ،مٹی اور تیز دھوپ کے کچھ نہ ہوگا لیکن یہاں صورت حال مختلف تھی۔جیسے جیسے ہم عرفات کے قریب پہنچے منٰی کی طرح کی مارکیز نظر آنے لگیں ان کا ڈیزائن قدرے مختلف تھا۔کوچیں جہاں پر ٹھہرائی گئیں وہاں سے ہم گروپ لیڈر کی قیادت میں چل پڑے۔اس دن غضب کی گرمی تھی،سورج آگ اگل رہا تھا اور لو بھی چل رہی تھی۔

ہم لوگ کوچ سے اترے تو مارکی تک جانے کے راستے میں دونوں طرف گولائی میں اونچا کر کے چبوترا سا بنا ہوا تھا جس پر کرسی میز کے سیٹ لگے ہوئے تھے۔اطراف میں پھول پودے اور درخت بھی تھے۔بہت سے زائرین چھتریاں تانے بیٹھے ہوئے تھے۔ٹھنڈے پانی کی بوتلیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ایک پک نک کا سا سماں تھا۔ہم تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ ایک بڑی مارکی کے آگے خواتین کو رکنے کی ہدایت ملی۔مرد آگے بڑھتے چلے گئے۔ہم خواتین مارکی میں داخل ہوئیں تو اندھیرا سا لگا۔تیز دھوپ سے اندر آئے تھے اس لئے آنکھوں کو اندر کی وشنی سے مانوس ہونے میں وقت لگا۔اور جب آہستہ آہستہ اندر کا سین آشکارا ہوا تو۔۔۔

اللہ اللہ کیا سین تھا۔ دبیز قالین بچھے ہوئے تھے۔ گاؤ تکیے اور مزید ٹیک لگانے کے لیے غلاف چڑھے اسٹول۔ خواتین نے اپنی اپنی پسند کی نشستیں سنبھال لیں۔ میں سامنے ہی اسٹول بچھا کر بیٹھ گئی کیونکہ قالین پر بیٹھنا اور اُٹھنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا دوسری خواتین کی طرح گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ بلکہ سو جاؤں۔ مجھے ایسا لگا جیسے ہم کسی ادبی یا ثقافتی محفل میں شرکت کے لیے آئے ہیں (ایسے موقعوں پر شیطان اسی طرح ورغلاتا ہے) جلدی سے لاحول پڑھی۔ کچھ اندھیرا بھی تھا اور گرمی بھی۔ کسی نے زور سے کہا۔ یہاں اتنی گرمی اور اندھیرا کیوں ہے۔ ہماری گروپ لیڈر بولیں 'یہ مقامِ عرفات ہے یہاں ہم عبادت اور توبہ کرنے آئے ہیں۔ بیٹھنے کی جگہ مل رہی ہے یہی کافی ہے، نہ یہاں روشنی کی سہولت ہے اور نہ اے سی کی۔ ابھی ان کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ ہماری مارکی روشنی سے جگمگا اٹھی ساتھ ہی ساتھ چاروں کناروں پر لگے ہوئے اے سی بھی چل پڑے۔

وہ خود ہکا بکا رہ گئیں کیونکہ ہمیں سیمینار میں یہ بات بار بار جتائی گئی تھی کہ عرفات اور مزدلفہ میں سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہوں گی۔ اور یہاں تو منٰی سے بہتر انتظام نظر آرہا تھا۔ بہر حال گروپ لیڈر اور ان کی ساتھیوں نے بھی اپنا مورچہ سنبھالا۔ ساتھ ہی ساتھ کھانے کا اہتمام بھی شروع ہوگیا۔ کھانا پیک کیا ہوا ہمارے ساتھ ہی آیا تھا اور اس کے بڑے بڑے کارٹن اندر لاکر رکھ دیے گیے تھے۔ خواتین اپنا اپنا حصہ لینے جارہی تھیں، مجھے کھانے سے زیادہ باتھ روم جانے کی خواہش بے چین کئے ہوئی تھی۔ وضو کر کے چلی تھی لیکن اب جانا ضروری ہوگیا تھا۔ بہر حال کھانا پینا تو برائے نام ہی تھا۔ میں تھوڑی دیر انتظار میں رہی کہ کوئی باہر جائے تو اس کے ساتھ جاسکوں۔ سب مصروف تھے۔ پھر ہمت کر کے میں خود ہی نکل پڑی۔ مارکیوں کے بیچ کہ خاصا چوڑا راستہ تھا، اونچائی پر جانے کے لیے اس پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس طرح دونوں طرف آسانی سے آجا سکتے تھے۔ میں آہستہ آہستہ دو تین سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، بہت سی خواتین بائیں طرف جارہی تھیں، کوئی سائن نہیں تھا مارکیاں بھی سب ایک سی تھیں۔ منٰی میں ٹائلٹ اور وضو خانے کھلی جگہ پر تھے اس لیے ڈھونڈنے میں مشکل نہیں ہوتی تھی۔ یہاں معاملہ مختلف تھا بہر حال میں بھی ان خواتین کے پیچھے ہولی۔ وہ پردہ اٹھا کر ایک مارکی میں گھس گئیں۔ اندر کچھ کھلی جگہ نظر آئی۔ میں بھی ان کے ساتھ اندر چلی گئی۔ وہاں عورتوں کے لیے وضو خانے اور ٹائلٹ تھے لیکن باہر سے نظر نہیں آسکتے تھے۔ بہت زیادہ بھیڑ نہیں تھی میں قطار میں کھڑی ہوگئی۔ باری آنے پر اندر گئی اللہ تعالی کا شکر ادا کیا ابھی

یہاں معاملہ صاف ستھرا تھا۔ باہر نکل کر وضو کیا اور واپس اپنی مارکی کی طرف رخ کیا۔ اندر جا کر ساتھ بیٹھی خواتین کو بتایا کہ ابھی فارغ ہو کر آجائیں۔ کچھ میرے کہنے پر اٹھ کر گئیں اور تھوڑی دیر میں توبہ توبہ کرتی واپس آ گئیں۔ اس قلیل عرصے میں انتظار کے لیے قطار بھی بڑھ گئی تھی اور اندر کی غلاظت بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم جن حالات میں وہاں تھے اور انتظامیہ نے جو بھی ممکن تھا سہولت کے لیے فراہم کر دیا تھا۔ مگر میں منیٰ سے یہی بات کہتی اور سوچتی آ رہی تھی کہ اس بدانتظامی میں یعنی غلاظت کے بڑھنے میں کہیں نہ کہیں استعمال کرنے والوں کا بھی قصور ہے۔

ہم سب پر نہ صرف ذمہ داری عائد ہوتی ہے بلکہ ایک طرح سے یہ اخلاقی فرض بنتا ہے، ہر فرد اپنے طور پر غلاظت کو اِدھر اُدھر نہ پھینکے۔ ٹائلٹ کو استعمال کے بعد صاف ستھرا چھوڑے۔ ہر جگہ مسلم شاور لگے ہوئے تھے اور پانی کا معقول انتظام تھا۔ اس کے باوجود خواتین گندگی بکھیر کر آ جاتی تھیں شاید یہ سوچ کر کہ دوسری آنے والی صاف کر دے گیں۔ جب تک یہ سوچ رہے گی ہم گندگی کے اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے۔ الحمدللہ ہمیں حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ ہم سب مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات سے بخوبی واقف ہیں کی 'صفائی نصف ایمان ہے'۔ پھر یہ سب کیوں۔۔۔؟ میں اس سوال کے جواب کو ڈھونڈنے میں ناکام رہی۔ یہاں جو میں نے دیکھا محسوس کیا وہ لکھ دیا۔ یہ شکایت نہیں ہے خود اپنا محاسبہ ہے۔ کیونکہ دیکھا جائے تو جب ہم حج کی نیت کر کے اپنا گھر بار چھوڑ کر روانہ ہوتے ہیں تو یہ ایک قسم کا جہاد بھی ہے راستے میں جو بھی صعوبتیں ملیں، پریشانیاں اٹھانی پڑیں، ہم انہیں نہ صرف برداشت کریں بلکہ انتہائی صبر و شکر کا مظاہرہ بھی کریں۔ جیسا میں نے اوپر عرض کیا ان مسائل کے بیان کرنے کا مقصد شکوے شکایت نہیں بلکہ اس کا حل تلاش کرنا ہے اور یہ ضرور ہوگا ۔۔۔انشااللہ ۔

کھانے پینے کے بعد ظہر کی نماز کی تیاری شروع ہوگئی۔ ہمارے ساتھ جو مرد حضرات تھے ان کی مارکی کسی وجہ سے برابر میں نہ مل سکی۔ مائک سسٹم کام تو کر رہا تھا مگر آواز اچانک غائب ہو جاتی۔ یعنی وہی صورت حال تھی جو منیٰ میں تھی، جبکہ منیٰ میں ان کی مارکی بالکل برابر میں تھی۔ ظہر کی نماز خوش اسلوبی سے ادا ہوئی۔ ہمارے گروپ کے مین لیڈر نے بہت اچھے اور جامع الفاظ میں عرفات کے میدان میں عبادت کی فضیلت بیان کی۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت دعاؤں کے لیے کتنا اہم تھا اس بارے میں بھی تفصیل سے بات کی۔ میں سوچ رہی تھی جس ماحول میں ہم موجود تھے اس میں خشوع و خضوع سے دعائیں اور عبادات کرنی مشکل تھیں۔ مارکی میں خواتین کے لیٹنے

بیٹھنے کے علاوہ بات چیت اور آنے جانے کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک عجیب سی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پھر میں نے کچھ خواتین کو اپنا سامان اٹھا کر باہر جاتے دیکھا۔ ناہید اور پروین تو بہت دیر سے غائب تھیں۔ میں نے اپنی ہم نام سے کہا' چلیں باہر چل کر بیٹھتے ہیں'۔ وہ ہوں ہاں کر کے ٹال گئیں۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ زبیر تو مجھے بتا گئے تھے کہ ظہر کے بعد وہ پہاڑی کی طرف چلے جائیں گے اور پھر عصر کے بعد لوٹیں گے۔ مجھے انہوں نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ اکیلی ہرگز باہر مت جایئے گا۔ ایک تو راستہ ناہموار تھا، دوسرے اپنی کرسی کو اٹھا کر چلنا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہی تھی کہ میری ہم نام بھی غائب ہو گئیں۔ اب جیسے غائبانہ دل سے آواز آئی 'تم بھی ہمت کرو اور باہر نکل جاؤ وقت بہت قیمتی ہے'۔ میں فوراً کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے فولڈ کیا اپنا رگ سیک کندھے پر ڈالا اور باہر نکل گئی۔

دائیں طرف کچھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک چبوترا سا بنا ہوا تھا جو اس وقت کھچا کھچ زائرین سے بھرا ہوا تھا اِدھر اُدھر منڈیروں پر بھی لوگ ٹک گئے تھے۔ امام صاحب حج کا خطبہ دے رہے تھے ، جو ظہر کی نماز کے بعد شروع ہوا ہوگا۔ بھیڑ بہت تھی لوگ میرے دائیں بائیں ہر طرف سے آ جا رہے تھے۔ میرا سر گھومنے لگا۔ بہتر یہی تھا کہ وہاں سے اتر آؤں۔ لوگ کافی دور تک بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بھیڑ سے بچ بچا کر بائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ ہماری مارکی کے ساتھ چبوترے نما کھلا ہوا حصّہ تھا جہاں مختلف فاصلوں سے لوگ بیٹھے عبادت کر رہے تھے۔ یہاں مجھے اپنی ہم نام بھی نظر آئیں ۔ کچھ فاصلے پر مارکی کی اور خواتین بھی بیٹھی ملیں۔ سب اپنے طور پر دعاؤں میں مصروف تھے، یہ لمحات یہ وقت ان کا اپنے لیے، اپنے کنبے داروں اور دوستوں کے لیے تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا۔ اس وقت سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک جگہ اپنی کرسی کھول کر رکھی، کچھ فاصلے پر ایک صاحب بیٹھے تھے۔ میں اپنی دعاؤں میں مصروف ہو گئی۔ گڑگڑا کر اس رب کریم سے اپنے لیے بچوں کے لیے، پوتے پوتیوں کے لیے اور جس جس نے خاص دعا مانگنے کا کہا تھا سب کے لیے اجتماعی دعا کی۔

پروردگار قبول کرنے والا ہے۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ بیگ سے دعاؤں کی کتاب نکالوں کہ اچانک موبائل کی گھنٹی زور سے بجی میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ میرے پاس تو موبائل تھا ہی نہیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے ان صاحب کا فون بجا تھا۔ حالانکہ ہمیں بار بار تاکید کی گئی تھی کہ اجتماعی عبادات کے مقام پر فون بند کر دیں یا بالکل ہلکا کر دیں۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن ان

صاحب کی گفتگو خاصی اونچی آواز میں ہو رہی تھی۔ خطاب غالباً بیگم سے تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے خفا لگ رہے تھے۔ ان کے قریب بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر چل دیے۔ میں فاصلے پر تھی تو مجھے ایک ایک لفظ سنائی دے رہا تھا۔ میں نے صبر کیا شاید یہ تھوڑی دیر میں چپ ہو جائیں لیکن ان کا مذاکرہ جاری رہا۔ میں جلدی سے کھڑی ہوگئی، کرسی کو فولڈ کیا اور پھر روانہ ہوگئی۔ وقت گزرا جا رہا تھا، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس دفعہ میں نے بالکل باہر نکلنے کا قصد کیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں چبوترا بنا کر میز کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کہیں بھی تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی ایک تو چھتریاں لگی ہوئی تھیں پھر لوگوں نے کرسیاں قریب گھسیٹ کر ہر میز کے گرد گھیرے بڑھا لیے تھے۔

سخت گرمی تھی اور سورج واقعی سوا نیزے پر رکھا ہوا تھا۔ سامنے وہ پہاڑی بھی نظر آ رہی تھی جہاں زائرین اوپر چڑھتے اور عبادت کرتے دیکھے جا سکتے تھے۔ باہر سڑک پر بھی لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔ ایمبولینس کا سائرن بھی سنائی دے رہا تھا (بعد میں زبیر نے بتایا بہت سے لوگ جو پہاڑی پر چڑھ تو گئے تھے لیکن تپتی دھوپ میں زیادہ دیر نہ بیٹھ سکے اور بے ہوش ہو گئے، فرسٹ ایڈ کے کارندے ان کی مدد کے لیے موجود تھے پھر ان لوگوں کو ایمبولینس میں مارکیوں تک لایا گیا)۔ میں جگہ کے لیے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ ایک کرسی خالی نظر آئی میں نے لپک کر اس پر قبضہ کر لیا۔ کوئی شاید ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا۔ میں بیٹھ کر دعاؤں میں مصروف ہوگئی۔ کچھ لوگ ہولے ہولے دعا مانگ رہے تھے کچھ بہ آواز بلند اللہ تعالی کے حضور گڑگڑا رہے تھے، التجائیں کر رہے تھے۔ توبہ و استغفار کا ورد جاری تھا، آنکھیں بند تھیں اور آنسوؤں سے چہرے تر تھے۔ دعاؤں کے ان لمحات میں، میں نے اللہ تعالی کے قرب کو محسوس کیا۔ شاید سب کے یہی محسوسات تھے۔ سایے کے باوجود میں سورج کی تپش کو اپنی پیٹھ پر محسوس کر سکتی تھی۔ اب آہستہ آہستہ لوگ اپنے خیموں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ میں بھی اپنی مارکی کی طرف چلدی۔

زیادہ تر خواتین واپس آ چکی تھیں۔ مغرب سے پہلے کا وقت بہت قیمتی تھا۔ سیمینار میں بتایا گیا تھا کہ اس دوران جتنا ہو سکے کھڑے ہو کر توبہ و استغفار اور گڑگڑا کر دعائیں مانگی جائیں۔ جہاں اتنی ساری خواتین ہوں وہاں شور اور باتیں نہ ہوں۔۔؟ مارکی میں بھنبھناہٹ سی پھیلی ہوئی تھی۔ بار بار اعلان ہو رہا تھا، خواتین خاموش ہو جائیں اور خاموشی سے عبادت میں مصروف ہوں۔ میں نے مارکی کا ایک کونا ڈھونڈ لیا جہاں کوئی نہیں تھا وہاں قبلے کی طرف منہ کر کے۔ دعاؤں میں مصروف ہوگئی۔

''اے اللہ میں حاضر ہوں تیرے حضور میں، یہ تیری گناہ گار بندی، بخش دے میری خطاؤں کو اور قبول

فرما ہر وہ جائز دعا جو میں نے اپنے بچوں،، اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے مانگیں۔'' جو دعائیں یاد تھیں خاص طور پر مغفرت کے لیے وہ پڑھتی رہی۔ ویسے بھی عبادت اور دعا ہر بندے اور اللہ کے بیچ کا معاملہ ہے۔ اور جب مانگنے والا دنیا سے بے خبر ہو کر اللہ سے لو لگا لے تو سبحان اللہ۔ میری آنکھیں بند تھیں۔۔۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ گروپ لیڈر اعلان کر رہی تھیں۔ مغرب کا وقت ہو گیا ہے آپ سب کوچ کی طرف جانے کی تیاری کریں۔ میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اچانک ہی ہماری مارکی میں چہل پہل اور سامان اٹھا کر باہر نکلنے کی کاروائی شروع ہو گئی۔ میں دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ناہید اور پروین بھی آ گئیں۔ مجھے انتظار تھا زبیر کا، وہ جیسے ہی نظر آئے میں باہر نکل آئی۔ انہوں نے سامان مجھ سے لے لیا۔ بہت تھکے تھکے لیکن مطمئن نظر آ رہے تھے۔ بتانے لگے ماشاللہ مغرب سے ذرا پہلے نیچے اتر کر آئے تھے۔ پھر مارکی میں عبادت اور دعائیں کیں۔

کہنے لگے آپ نے اچھا کیا باہر نہیں نکلیں۔ تیز دھوپ اور لو چل رہی تھی۔ لوگ خاص طور سے بوڑھے افراد کافی تعداد میں لو لگنے اور پانی کی کمی (dehydration) کی وجہ سے بے ہوشی کے عالم میں طبی امداد کے لیے لے جائے گئے ہیں آپ نے ایمبولینس کا سائرن تو سنا ہو گا۔ میں ہوں ہاں کر کے ٹال گئی۔ ہم لوگ کوچ میں سوار ہوئے۔ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز ایک ساتھ ادا کرنی تھی۔ کوچ میں اعلان ہوا مزدلفہ پہنچ کر ہمیں مقررہ جگہ پر قیام کرنا ہو گا۔ اس لیے گروپ کے ساتھ رہیں۔ سلیپنگ بیگ تو پہلے ہی دے دیے گئے تھے۔ اب رات کے کھانے کے لیے فوڈ پیک بھی سب میں تقسیم ہو گئے۔ کوچ میں خاموشی تھی۔ زیادہ تر لوگ اونگھ رہے تھے۔ زبیر بھی ان میں شامل تھے۔ گو کہ باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی لیکن تمام راستہ روشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوچوں اور پیدل چلنے والوں کے قافلے رواں دواں تھے۔ شور، روشنی، حرکت اور کہیں کہیں۔۔ 'لبیک اللھم لبیک'۔۔ کی صدا گونج رہی تھی۔ مذدلفہ زیادہ دور نہیں تھا، عرفات اور منیٰ کے راستے میں پڑتا ہے لیکن وہی مسئلہ، ٹریفک اور پیدل چلنے والے زائرین۔ ہماری کوچ سرک رہی تھی کہیں کہیں کافی دیر کھڑی رہی۔

☆☆☆

مزدلفہ میں قیام

ہم مزدلفہ پہنچے تو نو بجنے والے تھے۔ جیسے جیسے مزدلفہ قریب آتا گیا ہمیں زائرین کی ایک بڑی تعداد نظر آئی جو غالباً کسی گروپ کے ساتھ نہیں تھے۔ جیسے ہی مزدلفہ کی حدود شروع ہوتی ہیں بس وہیں سے انہوں نے اپنا پڑاؤ ڈالنا شروع کر دیا، کچھ نے صرف چٹائیوں اور چادروں پر اکتفا کیا، کہیں کہیں سلیپنگ بیگ بھی بچھے نظر آئے۔ ہر حال مقصد وہاں رات گزارنی اور ممکنہ عبادت کرنی تھی۔ ہماری کوچ جہاں پارک کی گئی وہ کوچوں کا پارکنگ ایریا تھا۔ جہاں تک نگاہ دوڑاؤ کوچیں ہی کوچیں تھیں اور ان میں سے برآمد ہوتی ہوئی زائرین کی تعداد، جس کا شمار ناممکن تھا۔ ہمارے گروپ لیڈر نے 'الاحسان' کا بینر اٹھاتے ہوئے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ جو لوگ تیز چل سکتے تھے وہ ان کے ساتھ کافی آگے نکل گئے۔ مجھ جیسے آہستہ چلنے والے، بوڑھے افراد اور وہیل چیر پر بیٹھے ہوئے لوگ کافی پیچھے رہ گئے۔ تیز چلنے والوں نے مقررہ جگہ پہنچ کر اپنی اپنی سہولت کے مطابق سلیپنگ بیگ بچھا لیے۔ جب تک ہم کچھوے کی چال چلتے ہوئے پہنچے، جو جگہ بچی تھی وہ عین مردانہ بیت الخلا کے سامنے تھی۔

مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، زبیر، ناہید اور پروین کی فیملی نے وہیں پر جلدی جلدی سلیپنگ بیگ بچھا دیے۔ وہیں قریب ہی ایک سعودی جوڑا بھی بیٹھا ہوا تھا دونوں نے ساتھ ساتھ اپنا سونے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اس جگہ روشنی بہت کم تھی اس لئے پتہ لگانا مشکل تھا کہ آگے تک لوگوں نے کس طرح بستر لگائے ہیں۔ اس جوڑے کو دیکھ کر زبیر، ٹیپو، منٹو اور روحی بھی ہمارے پاس آ گئے۔ ابھی لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ وہ سعودی اٹھ کر ان کے پاس آیا اور بہت غصہ میں بولا' آپ لوگ یہاں کیسے لیٹ سکتے ہیں یہاں صرف خواتین ہیں آپ سب دور ہٹ کر سونے کا بندوبست کریں'۔ زبیر اور دوسرے حیران تھے۔ زبیر نے رسانیت سے کہا 'خواتین اپنے محرم کے ساتھ رہ سکتی ہیں جیسے آپ ہیں'۔ اب اس کی بیوی بھی آ گئی اور اس نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔ ٹیپو کو غصہ آنے لگا لیکن زبیر نے اسے روک دیا اور سعودی کو ایک طرف لے گئے، پیار سے سمجھایا، کیسے سمجھایا میں نہیں جانتی، اتنا ضرور ہوا کہ وہ خود بھی بیوی سے الگ ہو کر تھوڑے فاصلے پر مردانہ حصے میں چلا گیا۔

اب میں ناہید اور پروین تھے۔ میرے لیے ڈبل سلیپنگ بیگ بچھایا گیا۔ یہ مرحلہ طے ہوا تو باتھ روم اور وضو کی طرف خیال گیا۔ ابھی مغرب اور عشاء کی نماز پڑھنی تھی۔ زبیر کو آواز دی وہ فوراً آ گئے نئی جگہ تھی اور رش کا عالم یہ تھا کہ ہر طرف سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گروپ کے بہت سے لوگوں نے مقررہ مقام سے ہٹ کر، جہاں، انہیں سہولت محسوس ہوئی، قیام کر لیا تھا۔ بہر حال میں زبیر کے ساتھ روانہ ہوئی خواتین کا وضو خانہ اور بیت الخلا زیادہ دور نہیں تھے۔ زبیر مجھے انتظار کرنے والی قطار میں کھڑا کر کے مردانے کی طرف چلے گئے، اس ہدایت کے ساتھ کہ آپ مجھے یہیں ملیے گا۔ مزدلفہ کے بارے میں سیمینار میں اور منیٰ سے روانہ ہونے سے پہلے بھی بار بار بتایا گیا تھا کہ یہاں ہر انتظام واجبی ہے اور ہمیں انتہائی صبر و تحمّل کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ الحمدللہ زیادہ تر لوگ اس پر عمل پیرا تھے۔ خواتین کی طرف اندر جو حال تھا اس کا ذکر نہ کرنا بہتر ہے۔ میں باہر نکل کر آئی، اللہ کا شکر ادا کیا۔ مزدلفہ میں زیادہ تر ریت اور مٹی تھی صرف بیت الخلا کے آس پاس کنکریاں اور چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ زائرین یہیں سے کنکریاں جمع کرتے نظر آئے۔ زبیر مجھے لینے آئے تو ان کے پاس بھی کنکریوں سے بھری تھیلیاں تھیں۔ ہم لوگ واپس لوٹے ناہید اور پروین نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھ کر نماز ادا کی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے، کوچوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اور صبح ہونے سے پہلے تک جاری رہا۔ میں نماز پڑھ چکی تو ناہید اور پروین آگے بڑھیں تا کہ مجھے سہارا دے کر نیچے لٹا سکیں۔ میں جانتی تھی یہ اکیلے ان کے بس کی بات نہیں۔ پھر زبیر کو پکارا گیا، وہ آئے تو ایک طرف سے انہوں نے بازو پکڑا دوسری طرف ناہید نے اور میں دھپ سے نیچے۔ اب صورت حال کچھ یوں تھی، میں چت لیٹی ہوئی تھی دائیں بائیں نہ کروٹ لے سکتی تھی اور نہ ہی جگہ تھی۔ پروین نے میرے اوپر چادر ڈال دی اور پانی کی بوتل برابر میں رکھ دی۔ کتاب پڑھنے کے لیے روشنی ناکافی تھی۔ زیادہ تر لوگ لیٹ کر اپنے اپنے موبائل پر سورتیں اور قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں نے زبانی پڑھنے میں عافیت سمجھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ چاروں طرف اتنی زیادہ حرکات و سکنات اور بھنبھناہٹ تھی کہ انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور تھا۔ میں یہ بھی کرنے سے قاصر تھی لہذا چت لیٹی آسمان کو تکتی رہی۔ ستارے نظر نہیں آ رہے تھے پھر بھی جیسے روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ لاکھوں کی تعداد میں زائرین مزدلفہ کے میدان میں کھلے آسمان تلے جمع ہوئے تھے، سب کا مقصد ایک تھا، منزل ایک تھی، دعائیں بھی تقریباً ایک جیسی تھیں بس مانگنے کا طریقہ مختلف تھا۔ نہ جانے میں کیا پڑھ رہی تھی، کیا سوچ

رہی تھی شاید تھوڑی دیر کے لیے آنکھ بھی لگ گئی۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میرے سرہانے کوئی وہیل چیر آ کر رکی ہو۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بڑی مشکل سے گردن گھما کر دیکھا، واقعی وہیل چیر میں ایک خاتون تھیں، ساتھ میں ان کی بیٹی یا کوئی اور رشتہ دار۔ مردانہ آواز بھی سنائی دی۔ بات چیت سے اندازہ ہوا وہ ان کے بیٹے تھے۔ میں نے تھوڑی سی اور گردن گھمانے کی کوشش کی، مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ میں لیٹی رہوں اور وہ بزرگ خاتون اس طرح تکلیف میں بیٹھی رہیں، ان کا چہرہ نظر آیا تو میں نے سلام کیا ساتھ ہی معذرت بھی کہ میں ایک دم اٹھ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ وہ بیچاری الٹی معذرت کرنے لگیں کہ ان کے دیر سے آنے کی وجہ سے ہماری نیند اور آرام میں خلل پڑا۔ اس دوران پروین اور ناہید بھی اٹھ کر بیٹھ گئیں تھیں۔ ناہید نے ان کی بیٹی سے کہا ' آپ چاہیں تو اپنی امی کو میری جگہ پر لٹا دیں۔' بیٹی نے بہت شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس کی والدہ کے لیے نیچے لیٹنا تو ناگزیر ہے، انہوں نے حج کے زیادہ تر ارکان اسی وہیل چیر پر ادا کیے ہیں اور ہوٹل کے کمرے میں بیڈ کے علاوہ وہ کہیں بھی لیٹ بیٹھ نہیں سکتیں۔

اس کی باتیں سن کر میں بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اللہ تعالی سے شرمندہ تھی کہ میں تو اپنی اتنی چھوٹی سی تکلیف کو اتنا بڑا سمجھ رہی تھی اور اِدھر یہ بہادر صابر اور شاکر خاتون ہیں جو نہ اٹھ بیٹھ سکتی ہیں نہ کھڑی ہو سکتی ہیں، پھر بھی اللہ تعالی کے گھر آنے کی تڑپ اور لگن انہیں کشاں کشاں کھینچ لائی ہے اور سلامت رہیں بیٹی بیٹا جو دونوں ہاتھوں سے اجر سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے زبیر کا خیال آیا، میرا بچّہ ۔۔اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر میرے لیے آ گیا تھا اور ہر قدم پر میرے لیے میری مدد کے لیے، مجھے سہارا دینے کے لیے حاضر تھا۔ اللہ تعالی جب کسی کو نیک کام کی سعادت دیتا ہے، خاص طور پر حج بیت اللہ کی، تو اس کے لیے وسیلے بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس دوران بیٹی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کو نماز بھی پڑھنی تھی۔ اس کی والدہ نے اشاروں سے پڑھی۔ بیٹا بار بار چکّر لگا رہا تھا، پھر ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اسے بھی تسلّی ہو گئی۔ صبح ہونے میں شاید ای گھنٹہ رہ گیا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ ہم نے، خاص طور کر میں نے، تہجد پڑھی یا نہیں۔ ہم چاہ رہے تھے وہ خاتون وہیل چیر پر ہی سہی تھوڑی دیر آرام کر لیں لیکن وہ بیچاری شاید جس تکلیف میں تھیں اس میں اپنے آپ کو مصروف رکھنا بہتر تھا۔

ہم لوگ حج کے حوالے سے باتیں کرتے رہے، سب کے اپنے اپنے مشاہدے اور تجربات تھے۔ فجر سے آدھا گھنٹے پہلے زبیر آ گئے مجھے یاد دلانے کہ اگر وضو وغیرہ کرنا ہے تو ابھی فارغ ہو جائیں ورنہ رش بڑھ جائے گا۔ ناہید بھی کھڑی ہو گئیں مجھے پھر ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے سے اٹھا کر کرسی

پر بٹھا دیا گیا۔ سانس بحال ہوئی تو روانہ ہوئے۔ مذدلفہ میں یہ آخری مہم تو سر کرنا تھی۔ خواتین کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آگے کتنے اور کس فاصلے پر مزید بیت الخلا تھے، نہ ہمیں اس کا اندازہ تھا اور نہ ہم جا سکتے تھے۔ وہ خواتین جو معذور تھیں یا بڑی مشکل سے اپنی وہل چیر سے اتر پاتی تھیں ان کا صبر اور حوصلہ دیکھ کر میں تو عش عش کر اٹھی۔ 'یا اللہ تو مجھ ان جیسا صبر و حوصلہ دے'۔ یہ دعا پڑھتے ہوئے میں انتظار کرنے والی خواتین کی صف میں شامل ہو گئی۔ آگے کے مرحلے اللہ پاک آسان کرتا رہا۔ باہر آئی تو ایسا لگا کہ جیسے کسی مسافر گاہ سے مسافر جلدی میں آدھا سامان چھوڑ کر روانہ ہو گئے ہوں۔ صبح صادق کی روشنی میں مذدلفہ کا میدان ایک لٹا پٹا منظر پیش کر رہا تھا۔ سلیپنگ بیگ اور چٹائیاں کھلی پڑی تھیں۔

زیادہ تر لوگ نماز پڑھنے اور وہاں سے کوچ کی طرف رخ کر رہے تھے۔ جگہ جگہ پانی کی بوتلیں اور کھانے کے کھلے ہوئے ڈبے پڑے ہوئے تھے، کوڑا اٹھانے یا پھینکنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ زبیر نے کہا آپ جلدی سے نماز پڑھ لیں پھر کوچ میں بیٹھنا ہے اور اس کے لیے قطار لگی ہوئی ہے۔ ہم اپنی جگہ پر واپس گئے۔ وہیل چیر والی خاتون کو ان کی فیملی لے جا چکی تھی۔ ہم نے نماز پڑھی۔ دعاؤں کا وقت نہیں تھا کوچ پکڑنی تھی سب سامان اٹھا کر (سوائے سلیپنگ بیگ اور چٹائیوں کے) ہم لوگ کوچ اسٹینڈ کی جانب چل پڑے۔ ہم سے پہلے بہت سے لوگ قطار میں کھڑے نظر آئے۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ پہلے میں بیٹھ جاؤں۔ ہمارے گروپ لیڈر نے آ کر ہدایت دی کہ برائے مہربانی ضعیفوں اور عورتوں کو پہلے بیٹھنے دیں۔ جس نے عمل کیا اجر کمایا۔ ہم لوگوں کی قطار بھی آگے سرکتی رہی۔ اب سورج آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ بتایا گیا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ جب تک مذدلفہ میں قیام رہے، عبادت اور دعائیں جاری رہیں۔ نیت بھی اسی بات کی تھی مگر فجر کی نماز کے وقت سے جو ہمیں دوڑایا گیا تھا اس میں سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ رات بھر کی جگار بھی تھی۔ سچ پوچھیں تو اس افراتفری میں سب کا ایک ہی مقصد تھا کہ کسی طرح کوچ میں بیٹھ کر منیٰ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائیں۔

اللہ اللہ کر کے ہماری باری آئی اور ہم سے آگے کھڑے کچھ جوان لوگوں نے ہمیں پہلے جانے دیا۔ ان کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلیں۔ کوچ میں بیٹھ کر سکون کا سانس لیا۔ اللہ تعالی کا شکر ادا کیا۔ اب ہماری کوچ آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ راستے میں دونوں طرف مذدلفہ میں قیام کے بعد جو سماں تھا وہ آنکھوں کے سامنے تھا۔ جتنی دور تک نظر جاتی تھی زائرین کے چھوڑے ہوئے بستر، چٹائیاں اور پلاسٹک بیگوں میں کھانے پینے کا سامان جا بجا بکھرا نظر آ رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے روانہ ہونے کی دیر تھی کہ آس پاس سے نہ جانے کن کونے کدھروں میں چھپے مقامی

سعودی مرد عورتیں اور بچے ان میدانوں میں سیکنڑوں کی تعداد میں پھیل گئے تھے۔سب کے پاس سامان جمع کرنے کے لیے جھولے نما تھیلے تھے۔مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ نہایت اطمینان سے چن چن کر سامان اٹھا رہے تھے۔خاص طور پر سلیپنگ بیگ جو اچھی حالت میں تھے اٹھا لیے گئے باقی وہیں پڑے رہے۔اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء بھی چنی جا رہی تھیں۔کیونکہ ہماری کوچ مذدلفہ کے علاقے سے نکلنے تک کئی جگہ کھڑی رہی اس لیے یہ پوری کاروائی میری آنکھوں میں کیمرے کی فلم کی طرح منعکس ہوگئی ہے۔

کوچ میں خاموشی تھی اور اس سکوت کو توڑتی ہوئی کہیں کہیں سے خراٹوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔جیسا میں نے پہلے عرض کیا تھا مذدلفہ منٰی سے زیادہ دور نہیں، وقت لگتا ہے تو سفر میں۔ہم لوگ غالباً ایک ڈیڑھ گھنٹے میں منٰی پہنچ گئے۔

☆☆☆

Kalyug ke Farishte(Main Zinda Aadmi hoon) by Khalid Hussain

RTD. D.C. (Jammu) cell-7006898585, 9419183485

خالد حسین (جموں)

کل یُگ کے فرشتے

اِک تم کہ تم کو فکرِ نشیب و فراز ہے
اِک ہم کہ چل پڑے تو بہر حال چل پڑے (کیفی اعظمی)

1985ء میں جب خالد حسین کو جالندھر سے تبدیل کر کے جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ سے اٹیچ کیا گیا تو اُس نے چیف سیکریٹری صاحب کو درخواست دی اور عرض گذاری کہ اُسے اپنے آبائی محکمے میں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ خالد حسین کو اُس کے پُرانے محکمے 'دیہی ترقی' میں بھیج دیا گیا تا کہ اُس کی اگلی پوسٹنگ ہو۔ کافی عرصہ انتظار کرنے اور بار بار التماس کرنے کے باوجود اُس کو اپنے گریڈ کے مطابق عہدہ دینے سے کمشنر صاحب انکار کرتے رہے۔ اُن کا اعتراض تھا کہ دو سال پہلے تک خالد حسین بلاک ڈیولپمنٹ افسر تھا اور سب سے جونیئر۔ اب تمام سینئر بلاک افسروں کی حق تلفی کر کے اُسے کیسے ضلعی سطحی کا افسر بنایا جائے جبکہ خالد حسین کا اصرار تھا کہ اُسے سرکار نے ضلعی سطح کا گریڈ دے کر جالندھر بھیجا تھا لہٰذا اُسے نئے گریڈ کے مطابق عہدہ دیا جائے جسکا وہ حق دار ہے۔ خالد کبھی کمشنر کے سامنے تو کبھی متعلقہ وزیر کے آگے پیش ہوتا اور حق مانگتا۔ اسی اُدھیڑ بُن میں تقریباً دو مہینے گذر گئے تھے۔ ایک دِن جب وہ مایوسی کے عالم میں متعلقہ وزیر کی کوٹھی کے لان میں بیٹھا تھا تو اُس کا دیرینہ واقف کار چپڑاسی عبدالرحمن اُسے ملا، جس نے مرزا افضل بیگ کے دورِ اقتدار میں خالد حسین کے ساتھ کام کیا تھا اور جو اب وزیر موصوف کا جمعدار تھا۔ وہ کہنے لگا کہ ''کب تک جوتیاں توڑتے رہو گے۔ یہاں ایسے کام نہیں ہوتا۔ تم ایسا کرو کہ کل شام چھ بجے صاحب کی کوٹھی پر آ جانا۔ میں تمہارا انتظار کروں گا اور صاحب سے خود ملاؤں گا۔ پھر دیکھنا تمہارا کام کیسے نہیں ہوتا۔ ہاں! آتی بار صاحب کے لئے مٹھائی کے طور پر دس ہزار روپئے ضرور لیتے آتا۔'' جب خالد حسین گھر لوٹا تو بڑا پریشان تھا۔ اُس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی پھر دس ہزار روپے کہاں سے لاتا۔ اسی اثنا میں اُس کے بچپن کا دوست اور ایکسائز ٹیکسیشن افسر ناصر حسین قریشی خالد حسین کو ملنے کے لئے آیا۔ ناصر قریشی نے خالد کے

چہرے کو غور سے دیکھا تو سمجھ گیا کہ تو بڑا چڑھا ہوا ہے۔ مایوسی اور پریشانی کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ اُس نے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے تو خالد حسین کی آنکھیں بھیگ گئیں، وہ کہنے لگا۔

" یار! کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ پچھلے دو مہینوں سے اپنی پوسٹنگ کے لئے کوشش کر رہا ہوں۔ کبھی کمشنر کے پاس تو کبھی منتری کے پاس جا جا کر میرے جُوتے گھِس گئے ہیں لیکن کوئی سُنتا ہی نہیں۔ گُل شاہ کی حکومت ہے اور ہر وزیر اپنا مونہہ کھول کر بیٹھا ہے۔ بغیر پیسے کے کوئی کام ہونا ناممکن ہے۔ اب کل وزیر موصوف کا جمعدار مجھے کہنے لگا کہ اگر پوسٹنگ کرانی ہے تو دس ہزار روپے لیکر کل شام وزیر صاحب کی کوٹھی پر آ جاؤ۔ وہ مجھے صاحب سے ملائے گا اور تمہارا کام ہو جائے گا۔ اب میں پریشان ہوں کہ دس ہزار روپے کہاں سے لاؤں۔'' خالد حسین کی حالتِ زار دیکھ کر ناصر حسین قریشی اُٹھا اور کہنے لگا: " تم فکر نہ کرو۔ ابھی تمہارا دوست زندہ ہے۔ میں ابھی گھر سے رقم لے کر آتا ہوں۔ تم کل منتری کے پاس جاؤ گے۔ اور اپنی پوسٹنگ کرا کے آؤ گے۔''

''اگر کام نہ ہوا تو میں تمہاری رقم کیسے واپس کروں گا۔''

''رقم جائے باڑھ میں۔ تم اپنی پوسٹنگ کراؤ۔ میں کبھی اپنی رقم کا تقاضا نہیں کروں گا۔''

چنانچہ دوسرے روز وقتِ مقررہ پر خالد حسین وزیر کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ عبدالرحمن اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ خالد نے رقم عبدالرحمن کے حوالے کی۔ وہ خالد حسین کو وزیر صاحب کے بیڈ روم میں لے گیا جہاں وزیر محترم ایک ہاتھ سے نمکین چائے نوش فرما رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ٹانگ کی کھجلی کھُجا رہے تھے۔ عبدالرحمن بڑی بے تکلفی سے اپنے صاحب سے مخاطب ہوا۔

''اس کا نام خالد حسین ہے۔ یہ نائب وزیر اعلیٰ مرزا محمد افضل بیگ کا پی، اے رہا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کام کیا ہے۔ بیگ صاحب کے بُرے دِنوں میں اِس نے اُن کی بہت خدمت کی تھی۔ خالد حسین چڑھتے سورج کو نہیں بلکہ ڈوبتے سورج کو سلام کرتا ہے اور تب تک اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتا جب تک کہ اُس کی سانسوں کی ڈور نہیں ٹوٹتی۔ یہ آپ کی بھی خدمت کرے گا۔ کرسی ہمیشہ نہیں رہتی آج خالد حسین کے کام آؤ۔ کل یہ تمہارے کام آئے گا۔ اس کو ڈسٹرکٹ پنچایت افسر، اے، سی، ڈی یا پروجیکٹ افسر ڈسٹرکٹ رورل ڈیولپمنٹ ایجنسی بناؤ، اور یہ لو۔ مٹھائی۔ اِس غریب کے پاس آپ کو دینے کے لئے اور پیسے نہیں ہیں۔ جب کمائے گا تو سب سے پہلے آپ کی خدمت کرے گا۔''

دس ہزار کی رقم عبدالرحمن نے وزیر صاحب کے ہاتھ میں دی۔ صاحب نے دونوں کی تواضع نمکین چائے اور کشمیری کلچے سے کی۔ اور یقین دلایا کہ چند روز کے اندر اندر خالد حسین کا آرڈر

جاری ہوجائے گا۔ خالد حسین نے گھر آ کر ساری بات ناصر حسین قریشی اور مجھے بتائی۔ میں بھی اُس کے بچپن کا لنگوٹیا یار ہوں اور ہمیشہ اُس کے سامانِ حرب کا مہلک ہتھیار رہا ہوں اور میرا نام محمد اشرف خان ہے۔ میں حسبی نسبی افغانی پٹھان ہوں۔ ہمارے اجداد ڈوگرہ مہاراجوں کی فوج میں سپاہی ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جنگجوانہ صلاحیتیں میرے خُون میں رچی بسی ہیں۔ اِسی وجہ سے میں لڑکپن اور جوانی کی معرکہ آرائیوں میں خالد حسین کے ہراول دِستے کا سالار ہوا کرتا تھا۔ خیر میں تو بات اپنے یار کی کر رہا تھا لیکن اپنا تعارف کرانا بھی لازمی تھا۔ دو چار دِن، دو چار ہفتوں کی مسافت بھی طے کر گئے تھے لیکن پوسٹنگ کا حکم نامہ جاری نہیں ہوا۔ اتنے میں در بامُوٗ ہو گیا اور دفاتر جموں سے سرینگر منتقل ہو گئے۔ خالد حسین، ناصر قریشی کو ساتھ لیکر سری نگر پہنچ گیا۔ ایک دن وہ اپنے ایک دوست شجع احمد کے اصرار پر رات گذارنے کے لئے اس کے گھر گلاب باغ گیا۔ صبح جب وہ سڑک پر بس کا انتظار کر رہا تھا تو وہاں سے ایک سرکاری کار گذری جو گاندربل سے آ رہی تھی۔ تھوڑا سا آگے چل کر کار رُک گئی اور ڈرائیور اُسے پیچھے کی طرف موڑنے لگا۔ کار خالد حسین کے پاس آ کر رک گئی۔ کار میں وہی وزیر صاحب بیٹھے تھے۔ جنہوں نے خالد کی پوسٹنگ کرنی تھی۔ یہ پوچھنے پر کہ وہ سڑک پر کیوں کھڑا ہے تو خالد حسین نے وزیر صاحب سے کہا کہ وہ بس کا انتظار کر رہا ہے تا کہ سیکریٹریٹ جا سکے۔ وزیر موصوف نے اُسے کار میں بٹھالیا۔ راستے میں دونوں باتیں کرنے لگے۔ منسٹر صاحب کہنے لگے۔

''تمہارے کام میں میرا کمشنر اڑچن ڈال رہا ہے۔ وہ تمہیں کیڈر پوسٹ دینے کیلئے تیار نہیں ہے۔ جبکہ میں نے مِسل پر لکھ دیا ہے کہ خالد کو ڈسٹرکٹ پنچایت افسر لگایا جائے۔ اس پر خالد حسین نے کہا'' آپ کس قسم کے منسٹر ہیں کہ ایک کمشنر آپ کا حکم نہیں مان رہا۔ میں جب بیگ صاحب کا پی، اے تھا تو سبھی کمشنر سیکریٹری اُن سے تھر تھر کانپتے تھے۔ کسی کی کیا مجال جو اُن کی حکم عدولی کرے۔ چیف سیکریٹری اکثر احتراماً اُن کے کمرے کا دروازہ خود کھولتا تھا۔ جبکہ آپ لوگوں کی کوئی بات تک نہیں سنتا۔ سیکریٹری یا کمشنر بنیادی طور پر ایک مشیر یا بڑا کلرک ہوتا ہے۔ جس کا کام صرف رائے دینا ہوتا ہے۔ وزیر کے فیصلے کی حکم عدولی کرنا نہیں۔''

خالد حسین کی باتیں سن کر وزیر صاحب خاموش ہو گئے تھے لیکن اُن کا چہرہ غُصے سے لال ہو چکا تھا۔ سیکرٹریٹ پہنچتے ہی اُنہوں نے محکمہ دیہی ترقی کے کمشنر کو بلایا اور بڑے رعب سے کہا کہ وہ خالد حسین کا آرڈر کیوں نہیں نکال رہے۔ کمشنر صاحب نے پھر اپنی بات دُہرائی کہ وہ خالد حسین کو کیڈر پوسٹ پر نہیں لگا سکتے۔ البتہ نان کیڈر پوسٹ پر لگانے کو تیار ہیں۔ وزیر صاحب نے کہا تو پھر

اُسے پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی اے لگائیں۔ کمشنر صاحب اُس پر تیار ہو گئے اور کہا کہ وہ فائل منظور ی کے لئے ابھی آپ کے پاس بھیجتے ہیں۔ وزیر موصوف نے پر پوزل منظور کیا اور مسل واپس کمشنر کو بھیج دیں۔ چنانچہ اُسی روز خالد حسین کا آرڈر بحیثیت پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے پونچھ جاری ہوا۔ ابھی پونچھ میں تعینات ہوئے اُسے ایک مہینہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ منتری صاحب نے اُسے فوراً جموں بُلایا۔ دوسرے دِن جموں میں وہ اُن کی سرکاری کوٹھی پر پہنچا تو وزیر صاحب نے اُس کے ہاتھ میں پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی اے ڈوڈہ کا آرڈر تھما دیا۔ جب خالد حسین نے ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگے۔ ''اوے ڈوگرے ڈنگر! پونچھ میں صرف پانچ بلاک ہیں جبکہ ڈوڈہ میں 14 بلاک ہیں۔ جاؤ، فوراً جا کر جائن کرو۔ اپنے لئے بھی روٹیاں بناؤ اور میرے لئے بھی۔ بعد ازاں عبدالرحمن جمعدار سے خالد حسین کو معلوم ہوا کہ وزیر صاحب نے امر سنگھ نام کے ایک افسر سے پونچھ پوسٹنگ کے لئے اتنی زیادہ مٹھائی وصول کی تھی کہ خالد حسین کا پونچھ سے جانا یقینی تھا۔

خالد حسین نے مجھے ایک اور وزیر شاہ صاحب کے آشیرواد اور پرشاد کی کہانی بھی سنائی تھی جو میں قارئین کی دلچسپی کے لئے بیان کرنے جا رہا ہوں۔ ہوا یوں کہ جموں و کشمیر میں چھ سال تک لگاتار گورنر راج اور صدر راج کے بعد مرکزی سرکار نے فیصلہ کیا کہ ریاست میں انتخابات کرائے جائیں۔ خالد حسین اُس وقت ڈپٹی ڈائریکٹر اسسٹنٹ جموں تعینات تھا۔ ایک دن اُس کے پاس ضلع ڈوڈہ کے ڈپٹی کمشنر سدھنشو پانڈے (آئی، اے، ایس) آئے اور کہنے لگے کہ الیکشن ہونے جا رہے ہیں اور خالد حسین کی ضلع ڈوڈہ میں اشد ضرورت ہے کیونکہ وہ ایک تجربہ کار افسر ہے اور ضلع ڈوڈہ میں بطور ریٹرننگ افسر 1987ء میں الیکشن کروا چکا ہے۔ لہٰذا اُس کی پھر ضرورت ہے۔ اُنہوں نے خالد حسین سے وعدہ کیا کہ انتخابات کے بعد اُسے مند پسند پوسٹینگ دی جائے گی۔ چنانچہ 1996ء میں الیکشن ہوئے۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ صاحب تیسری بار اقتدار میں آ گئے لیکن خالد حسین کی پوسٹنگ میں تاخیر ہوتی گئی۔ پانڈے صاحب مرکز میں چلے گئے اور کمشنر یُوگھوش انتقال کر گئے تھے لہٰذا خالد سے کیا گیا وعدہ وفا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اُس نے اپنی پوسٹنگ کے لئے بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک دِن خالد حسین کے پاس اُس کا ایک پنجابی ادیب دوست دلیپ سنگھ آیا جو پراپرٹی ڈیلر تھا۔ اُس نے خالد سے کہا کہ تالاب تلو میں ایک آشرم ہے۔ وہاں پولیس اور انتظامیہ کے بڑے بڑے افسران سوامی جی کے پروجن سُننے اور اُن کا آشیرواد لینے آتے رہتے ہیں۔ چھوٹی بڑی عدالتوں کے جج صاحبان اور سیاست دان بھی آتے ہیں اور اپنی مُرادیں پاتے ہیں۔ سوامی جی کے

پاس شاہ صاحب نام کا ایک وزیر ہر اتوار کو سوامی جی کے پروچن سُننے کے ساتھ ساتھ آشیرواد اور پرشاد لینے آتا ہے۔ اصل میں پرشاد کے ٹوکرے میں رنگدار کاغذوں کی تہہ کے نیچے بھاری رقم ہوتی ہے جو سوامی جی لوگوں کے کام کروانے کے عوض لیتے ہیں اور اپنی کمیشن کاٹ کر باقی رقم وزیر صاحب کو پرشاد کے ٹوکرے میں رکھ کر دے دیتے ہیں کسی کو شک بھی نہیں ہوتا اور لوگ وزیر موصوف کی سوامی بھگتی اور سیکولر ذہن کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ وہ خالد حسین کو سوامی سے ملانے تالاب تلو کے آشرم لے گیا۔ اُس نے سوامی جی سے کہا کہ ''یہ میرا دوست ہے اور ڈائریکٹر لوکل باڈیز جموں لگنا چاہتا ہے۔ آپ اس کا کام کرا دیں۔ جو خدمت ہوگی وہ کر دیں گے۔'' خالد حسین کو باہر بٹھا کر سوامی جی دلیپ سنگھ کو اپنے کمرے میں لے گئے اور جب اُس نے یقین دلایا کہ فکر والی کوئی بات نہیں خالد حسین کسی سے کچھ نہیں کہے گا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ اتوار کے روز خالد حسین کو لیکر آشرم آجائے۔ ساتھ میں ایڈوانس کے طور پر 50 ہزار روپئے بھی لائے۔ مقررہ دِن پر دلیپ سنگھ خالد حسین کو لیکر آشرم پہنچا اور رقم سوامی جی کے حوالے کی، تو انہوں نے کہا کہ انتظار کریں۔ تین بجے منتری جی آئیں گے تو سفارش کروں گا، پر یہ کس پوسٹ پر لگنا چاہتا ہے، تو دلیپ سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

''سوا جی جی! منتری جی کے محکمے میں ڈائریکٹر لوکل باڈیز جموں کی آسامی خالی ہے۔ خالد حسین وہاں لگنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ کام ہو جائے گا'' اور پھر دونوں کو انتظار کرنے کیلئے ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ پورے تین بجے کیبنٹ منتری شاہ صاحب کی کار آشرم گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ سوامی جی نے منتری جی کا سواگت کیا اور اُن کو لیکر ایک خصوصی کمرے میں لے گئے۔ پھر سوامی جی ایک ایک کر کے اسامیوں کو بُلانے لگے۔ جب خالد حسین کو بُلایا گیا اور وہ کمرے کے اندر داخل ہوا تو وزیر موصوف خالد کو دیکھ کر اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور سوامی جی سے کہنے لگے کہ آپ نے کِس بلا کو بُلایا ہے۔ اس کے پیسے واپس کریں۔ آپ نہیں جانتے کہ یہ مجھے ہر جگہ بدنام کر دے گا۔ اس کے بے شمار صحافی دوست ہیں۔ پھر وہ خالد حسین سے مخاطب ہوئے اور بولے کہ اُس کا کام ہو جائے گا لیکن خدا کے واسطے اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ 5 بجے کے قریب سوامی جی کا ایک سیوادار پرشاد کا ٹوکرا لیکر کمرے سے نکلا ٹوکرا بالکل اُسی طرح سجایا گیا تھا جس طرح سے دلیپ سنگھ نے خالد کو بتایا تھا۔ سیودار نے پرشاد والے ٹوکرے کو کار کی پچھلی سیٹ پر رکھا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ ٹوکرے کو سیٹ سے گرنے نہ دے۔ کیونکہ اُس میں لکشمی دیوی بھی تھی اور اُس کا پرشاد بھی۔

اب خالد حسین اِس انتظار میں تھا کہ کب ڈائریکٹر لوکل باڈیز کا آرڈر نکلتا ہے اور وہ نئی

پوسٹ پر حاضر ہوتا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد گورنمنٹ آرڈر نکالا لیکن کسی اور کا۔ خالد حسین کا نہیں۔ خالد حسین نے دلیپ سنگھ کو فون کیا اور کہا کہ سوامی جی سے اُس کے پیسے واپس دِلائے جائیں۔ دلیپ سنگھ اور خالد حسین دونوں آشرم پہنچے اور رقم واپسی کا تقاضا کرنے لگے۔ چار پانچ چکر لگانے کے بعد سوامی نے چالیس ہزار روپئے واپس کر دیئے اور دس ہزار روپئے آشرم کے چندے کے طور پر رکھ لئے۔ خالد حسین نے شکر کیا کہ گنگا گئی ہڈیاں واپس مِل گئیں۔ کچھ دیر بعد یہ قصہ خالد حسین نے اپنی ایک دوست پروفیسر انجلی ٹھُسو کو سنایا تو وہ آگ بگولا ہو کر سوامی کو گالیاں دینے لگی اور کہنے لگی کہ سوامی کے بھیس میں وہ پکا حرامی ہے۔ اُس نے میری بُوا کو پچھلے سولہ سال سے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہے اور اُس کی شادی نہیں ہونے دی۔ وہ آج بھی آشرم میں رہتی ہے اور اُسے شردھالو ماتا جی کہہ کر بُلاتے ہیں کیونکہ آشرم کا سارا نظم ونسق اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد خالد حسین کو انشورنس، جی پی فنڈ اور گریجوٹی کا کافی پیسہ ملا۔ تو اُس نے بٹھنڈی میں ایک پراپرٹی ڈیلر اشوک کمار گپتا سے ایک مکان کا سودا کیا جس کا ڈھانچہ تو مکمل تھا لیکن پلستر اور کھڑکیاں اور دروازوں کا کام چل رہا تھا۔ مکان کا سودا 30 لاکھ میں طے ہوا۔ اُس نے خالد حسین سے کہا کہ اگر وہ آدمی رقم ایڈوانس میں دے دیں تو وہ دو مہینوں کے اندر اندر مکان کا قبضہ دے دے گا خالد حسین نے اُسے تین قسطوں میں چیکوں کے ذریعے 18 لکھ روپئے دیئے اور باقاعدہ دستخط شدہ ہنڈیاں حاصل کیں اور الگ سے اسٹامپ پیپر پر بھی رسید لی۔ اِسی طرح اپنے دوست سردار عجب سنگھ کے ساتھ مل کر گوگو کالونی ہمہامہ سرینگر میں ایک کنال کا پلاٹ 28 لاکھ میں خریدا۔ آدمی رقم خالد حسین نے ادا کی اور آدھی عجب سنگھ وزیر نے۔ سرینگر والا پلاٹ کوا پریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی گوگو کے چیئر مین نذیر احمد ڈار سے خریدا گیا۔ رجسٹری کرانے کیلئے کاغذات مکمل کر لئے گئے۔ فریقین نے اسٹامپ پیپر پر دستخط کر دیئے ایک کنال پلاٹ کا نمبر 251 تھا۔ لیکن حزب المجاہدین کے نوجوان کمانڈر برہان وانی کی ٹاسک فورس کے ہاتھوں ہلاکت کی وجہ سے وادیٔ کشمیر میں حالات خراب ہو گئے۔ لوگ سڑکوں پر آ گئے۔ کرفیو لگ گیا اُن حالات میں عجیب سنگھ اور خالد حسین جموں آ گئے۔ سات آٹھ مہینے کے بعد جب خالد حسین سرینگر گیا تو پتہ چلا کہ اُن کا پلاٹ کسی اور کو بیچ دیا گیا ہے اور اُنھیں دوسرا پلاٹ دینے کا وعدہ کیا گیا۔ اسی دوران عجب سنگھ کو ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھیج دیا گیا۔ تین سال کے بعد عدالت کا فیصلہ آیا۔ عجب سنگھ بری ہو گیا۔ نذیر احمد ڈار نہ تو زمین کا پلاٹ دے رہا تھا اور نہ ہی رقم واپس کر رہا تھا۔ جب ہم سرینگر جاتے تو وہ غائب ہو جاتا۔ اس نے

نہ جانے کتنے لوگوں کو دھوکہ دیا تھا۔ عجب سنگھ نے پولیس کے ایک واقف کار آئی، جی، پی سے بات کی۔ اُس نے نذیر احمد ڈار کو تھانے میں بند کرایا۔ اُس کی سکارپیو ضبط کر لی۔ اس طرح عجب سنگھ نے اپنی رقم نذیر احمد ڈار اُس سے نکلوالی۔ اب خالد حسین پھنس گیا۔ تمام کوششیں رائیگاں ہوگئیں۔ آخر یہ معاملہ خالد کی وفات کے بعد ختم ہوگیا۔ جبکہ جموں والے مکان کے لئے اشوک کمار گپتا کو دی گئی رقم میں سے دس لاکھ کی وصولی تو ہوگئی جبکہ باقی کی رقم ڈوب گئی۔

محمد اسلم قریشی (ریٹائرڈ آئی، اے، ایس) خالد حسین کے بچپن کا دوست تھا۔ دونوں نے میٹرک لگ بھگ ساتھ ساتھ کی تھی۔ وہ لجسلیٹو کونسل میں کلرک بھرتی ہوگیا اور خالد محکمہ دیہات سُدھار میں۔ خالد حسین نے دورانِ کلرک ادیب فاضل کا امتحان پاس کرلیا اور بی، اے کی تیاری کرنے لگا تو ایک دن اُسے اسلم قریشی نے کہا کہ وہ بھی آگے پڑھنا چاہتا ہے۔ خالد حسین نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ بھی ادیب کامل یا فاضل کا امتحان دے کر پھر بی، اے پاس کرلے تاکہ ترقی کے راستے کھل جائیں۔ سو محمد اسلم قریشی نے نہ فقط بی، اے کا امتحان پاس کیا بلکہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری بھی حاصل کی اور پھر قسمت کے دھنی اس دوست نے کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کا امتحان بھی پاس کرلیا اور بہت سے اہم عہدوں پر کام کیا۔ ایک بار وہ خالد سے کہنے لگا کہ اُس کے چھوٹے بھائی محمد افضل قریشی کو بلاک افسر بنانے میں خالد اُس کی مدد کرے۔ خالد حسین اُس کو لیکر متعلقہ وزیر صاحب کے پاس لے گیا۔ باتوں باتوں میں وزیر صاحب نے جموں کے سدھرا علاقے میں زمین خریدنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسلم اور خالد نے اس کے لئے سِدھرا میں دو کنال زمین منتخب کی۔ وزیر صاحب نے چالیس ہزار کی رقم زمین خریدنے کے لئے دی۔ دو کنال اراضی بیس ہزار روپئے فی کنال کے حساب سے خریدی گئی۔ اُنہی دِنوں گل شاہ کی حکومت مرکزی سرکار نے ختم کردی اور منتری جی اپنی رقم واپس مانگنے لگے۔ چنانچہ اُن کو رقم واپس کردی گئی۔ اسلم نے بیس ہزار اور خالد حسین نے بیس ہزار روپئے دے کر دو کنال زمین خود خرید لی۔ یعنی ایک ایک کنال دونوں نے خریدی۔ اقرار بیعہ ناصر حسین قریشی کے والد جیون بخش قریشی کے نام لکھا گیا کیونکہ وہ دونوں سرکاری ملازم تھے۔ پھر خالد اسلم قریشی سے اپنی ایک کنال زمین کے کاغذ اپنے نام لکھوانے کے لئے کہتا رہا اور وہ وقت مانگتا رہا۔ کیونکہ دونوں کی پوسٹنگ الگ الگ ضلعوں میں ہوتی رہی۔ پھر یوں ہوا کہ زمینوں کی قیمتیں بڑھنے لگیں۔ روز بروز قیمتوں میں اُچھال آتا گیا۔ لوگوں کی طبیعت خراب ہوتی ہے لیکن اسلم قریشی کی نیت خراب ہوگئی۔ اور وہ کہنے لگا کہ وہ اب بارہ مرلے زمین دینے کو تیار ہے۔ خالد نے کہا چلو بارہ

مرلے ہی اُس کے نام کروا کر زمین کا قبضہ دو،لیکن اس نے وہ بھی نہیں کیا۔ پھر بھی خالد حسین نے اُس کے ساتھ کبھی تعلقات خراب نہیں کئے۔ وہ اُسے ہمیشہ گرم جوشی سے ملتا رہا۔ دُعا گو ہوں کہ زندگی کے آخری سفر میں وہی زمین اُس کا دائمی مسکن بنے۔

خالد حسین کے سسُر کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی سعید اللہ ملک کے ہاں صرف دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ نسیم فردوس ، جو میری بھابھی ہیں۔ جبکہ تسنیم کوثر جو جاوید خان نامی شخص سے بیاہی گئی ہے۔ خالد حسین کی ساس اور سسر نے اپنے بھائی کا بیٹا محمد اسلم گود لے لیا۔ محمد اسلم خالد کی خوش دامن صاحبہ کے بھائی کا بیٹھا تھا جبکہ اُس کی ماں خالد کے سسر کی بہن تھی۔ محمد اسلم کو بڑے نازوں سے پالا گیا۔ اُس کی شادی کی ۔سعید اللہ ملک صاحب نے اپنی ساری جائیداد برابر تین حصوں میں دونوں بیٹیوں اور محمد اسلم کے نام کر دی اور بہنوں نے اپنا حصہ بھائی محمد اسلم کی سپر دداری میں دے دیا تا کہ وہ اس کا استعمال کر سکے۔ محمد اسلم کا سب سے چھوٹا بیٹا سلیمان پڑھنے میں کمزور تھا تو خالد حسین اُسے جموں لے آیا ور اپنے بیٹے یاسر عمران کے کاروبار میں اُس کو شامل کیا یعنی چار آنے کا حصہ دار اُسے بھی بنا دیا۔ اس کے علاوہ ہر مہینے پانچ ہزار کی رقم بطور تنخواہ بھی مقرر کر دی۔ سلیمان اور یاسر دونوں نمازی تھے۔ یاسر نے سلیمان پر پورا اعتماد کیا اور دُکان کا حساب کتاب سلیمان کے سپرد کر دیا جبکہ وہ اپنا زیادہ وقت فلاحی کاموں میں لگانے لگا۔ سلیمان نمازوں کی آڑ میں مکاری کرنے لگا اور دُوکان کو لوٹتا رہا۔ اس کی بے ایمانی اور بد دیانتی کا علم تب ہوا جب انکم ٹیکس وکیل نے بتایا کہ حساب کتاب میں بہت زیادہ گھپلا ہے۔ یا تو بنک میں 25 لاکھ روپیہ جمع ہونے چاہیں یا اتنی رقم کا مال دُکان میں ہونا چاہئے جبکہ دُکان میں تقریباً چار پانچ لاکھ روپئے کا مال نکلا۔ خالد حسین نے دکان بند کر دی اور حساب کتاب کے رجسٹر ضبط کر کے اُن کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ سلیمان بھاگ گیا۔ وہ دو سال سے یاسر عمران کو چونا لگا رہا تھا لیکن اُسے کوئی خبر نہ ہوئی۔ وہ اُدھار وصولی کی رقم بھی ہضم کر گیا۔ کل ملا کر شیطان خصلت سلیمان نے 30 لاکھ کا غبن کیا اور بھاگ گیا۔ رشتے داری کی وجہ سے خالد حسین نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی۔ محمد اسلم بھی شرمندہ تھا۔ اس قسم کے کچھ اور مالی نقصان بھی خالد حسین نے برداشت کئے لیکن کبھی پریشان نہیں ہوا۔ شور ہنگامہ نہیں کیا بلکہ رضائے الٰہی سمجھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں دیکھی۔

مٹھی باندھ آیا بندہ، ہاتھ پسارے جاتا ہے نہ کچھ لایا نہ کچھ لے گا، ناحق کیوں پچھتاتا ہے

(پلٹو صاحب)

دِل کا حال سنے دِل والا

Dil ka Haal Sune Dil Wala

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
آندھی میں بھی جس پیڑ کو ہلتے نہیں دیکھا

(پروین شاکر)

خالد حسین نے گوجرنگر میں نیا مکان بنایا اور 1987ء میں وہ وہاں رہنے کے لئے چلا گیا۔ اُس مکان میں منتقل ہونے کے بعد خالد حسین اور اُس کی بیگم نسیم فردوس ایک عجیب سی بے چینی اور پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اُن کے چہروں پر خوشی کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ وہ مضطرب اور رنجیدہ رہنے لگے۔ پھر یکِ بہ دیگرے ایسے واقعات ہوئے کہ مسلسل تین سال اُنہوں نے سکھ کا سانس نہیں لیا۔ وہ اچھے بھلے اُستاد محلے میں رہتے تھے جہاں اُن کا بچپن، لڑکپن اور جوانی گذری تھی۔ جہاں اُن کی بارات چڑھی تھی۔ جہاں اُن کے ہمسائے ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی تھے۔ جن کے ساتھ خالد حسین کے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔ اُس مشترکہ کلچر میں اُن کے بچے پل رہے تھے، لکھ پڑھ رہے تھے لیکن بڑا مکان بنانے کے جنون نے خالد صاحب کو گوجرنگر میں لا پھینکا۔ گوجرنگر ایک نئی مسلم کالونی تھی جس میں کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' والا معاملہ تھا۔ پونچھ، راجوری، ڈوڈہ، بھدرواہ، کشتواڑ، بانہال اور کشمیر وادی کے لوگوں نے اس نئی کالونی میں مکان بنائے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مستقل طور پر گوجرنگر میں رہتے تھے لیکن اکثر سردیوں کے تین چار مہینے گذار کر واپس چلے جاتے۔ گوجرنگر میں خالد حسین کے بڑے بیٹے ذاکر حسین نے اپنے کئی ہم عمر لڑکوں کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی تھی۔ یہ سب لڑکے بھلیس سے آئے اور گوجرنگر میں رہائش پذیر ایک دائمی اور جنونی بنیاد پرست مسلمان کے چنگل میں پھنس گئے۔ جو اُنھیں صلیبی جنگوں میں جنگجوؤں اور مجاہدوں کے کارنامے سناتا۔ اسلام کی سربلندی کیلئے خالد بن ولید، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد کی بہادری کے قصے سناتا۔ عملی جہاد کے لئے اُکساتا۔ انھیں مسجد میں لے جاتا اور اُنھیں بنیاد پرست بنانے کے حربے استعمال کرتا۔ من گھڑت حدیثیں سناتا۔ صحابہ کی باتیں کرتا۔ غرض اُس کا مقصد ان معصوم لڑکوں کو دھرم

زنجیریں پہنا کر اسلام کے مجاہد بنانا تھا اور دہشت گردی کی آگ میں جھونکنا تھا۔ حالانکہ وہ محکمہ پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین بھی کاکا حسین کی وساطت سے وہاں جانے لگا اور پنج گانہ نماز ادا کرنے لگا۔ اُس کی ماں خوش تھی کہ اُس کا بچہ حالانکہ دسویں جماعت میں پڑھتا ہے لیکن نیک سیرت ہے اور نماز کا پابند ہے۔ مگر اُس کو کیا معلوم کہ یہ آنے والے ایک بڑے طوفان کی علامتیں تھیں۔ جب خالد صاحب کی بیٹی ڈاکٹر سمعیہ تبسم کی شادی ہوئی تو ان لڑکوں نے ڈٹ کر کام کیا اور پورے گوجرنگر میں نام کمایا۔ گوجرنگر والے مکان میں عجیب وغریب حادثے ہونے لگے۔ بچوں اور بیگم خالد کو کبھی ڈراؤنے خواب آتے تو کبھی کمروں کے باہر برآمدے میں تازہ خون کے قطرے فرش پر پڑے ملتے۔ ایک بار خالد حسین کی بیگم کہنے لگیں کہ ''واپس اُستاد محلے چلیں، یہاں کوئی آفت آنے والی ہے۔ مجھے عجیب اور حیرت انگیز خواب آتے ہیں۔'' خالد صاحب اُن کی بات کو مذاق میں لے اُڑتے۔ 1988 میں زبردست سیلاب آیا۔ دریائے توی کا پانی پُل کے اوپر سے بہنے لگا۔ خالد صاحب نے چونکہ اپنا مکان توی ندی کے کنارے بنایا تھا۔ لہٰذا سیلابی پانی میں اُن کا پورا مکان ڈوب گیا۔ بڑا نقصان ہوا۔ عقل مند لوگوں کی یہ بات کہ ''دریائے کے کنارے اور پہاڑ کی ڈھلان یا نشیب میں کبھی مکان مت بناؤ'' بھی خالد صاحب کے پلے نہیں پڑی۔ بلکہ اُنہوں نے سیلاب کے بعد مکان کی دوسری منزل بھی بنا ڈالی۔ دوسرے سال برسات میں پھر سیلاب آیا۔ لیکن پانی پہلی منزل میں چار فٹ تک ہی پہنچا۔ پھر ایک اور حادثہ پیش آیا، ذاکر حسین کا ہم نام اور اُن کا گھریلو معاون، بجلی کی ہائیٹیشن وائر سے چپک گیا اور مرتے مرتے بچا۔ اس کو فوراً ہسپتال منتقل کیا گیا۔ دو مہینے اُس کا علاج چلتا رہا۔ وہ بچ گیا۔ ابھی اس سانحہ سے باہر نکلے بھی نہ تھے کہ خالد حسین کو پیغام ملا کہ ذاکر حسین میٹرک کے امتحان کا آخری پرچہ دینے کے بعد گھر نہیں لوٹا اور اس کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں چلا گیا۔ خالد حسین اُس وقت پونچھ میں اے، سی ڈی تعینات تھے۔ دوڑے دوڑے جموں پہنچے اور ذاکر کو تلاش کرنے لگے۔ اُس کے دوستوں سے پوچھا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے یا پھر جان بُوجھ کر اُن سے چھپایا جا رہا تھا۔ وہ دن کشمیر کی سیاست کے سیاہ دِن تھے۔ سیاسی اور مذہبی ماحول نہایت گرد آلود تھا۔ 1990ء کے اوائل میں مرکزی سرکار نے جگموہن جی کو ریاست کا گورنر بنا کر بھیجا اور وزیر اعلیٰ فاروق عبداللہ نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ جگموہن جیسے شخص سے 1984ء میں وہ گہرا زخم کھا چکے تھے۔ مجاہدین یا ملی ٹینٹوں کی کارروائیاں زوروں پر تھیں۔ کشمیری آزادی کے لئے جلوس نکال رہے تھے جن میں لاکھوں لوگ شرکت کرتے تھے۔ یوں لگ

رہا تھا کہ ایک منصوبے کے تحت مسجدوں سے کشمیری پنڈتوں کو دھمکیاں دیجارہی تھیں اور ان کو ٹارگٹ بنا کر قتل کیا جانے لگا تھا۔ ملی ٹینٹ ان مسلمانوں کو بھی قتل کر رہے تھے جو بھارتی ایجنسیوں کے لئے کام کرتے تھے۔ دہشت گردوں نے سب سے پہلے اُن کشمیری پنڈتوں کو نشانہ بنایا جو بھارت کی خفیہ ایجنسیوں میں ملازم تھے یا جو آر، آر، ایس کے ورکر تھے۔ اُس پنڈت جج کو بھی قتل کر دیا جس نے ''جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) کے بانی محمد مقبول بٹ کو پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ خالد صاحب کے دوست ایڈوکیٹ کشمیری لال بٹ کے والد کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔

انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بے بس ہو چکے تھے۔ اسی ماحول میں گورنر جگموہن کو دوسری بار تعینات کیا گیا تھا۔ گورنر راج لگتے ہی کشمیری پنڈتوں کی ہجرت وسیع پیمانے پر شروع ہوئی۔ موت سے ڈرتے اور زندگی کے لئے پناہ ڈھونڈنے کیلئے گورنر جگموہن نے اُن کا حوصلہ بڑھایا اور سرکاری ٹرانسپورٹ مہیا کرائی اور وہ وادیٔ کشمیر کی معتدل، ٹھنڈی اور صحت بخش ہواؤں کو چھوڑ کر جموں، اُودھم پور اور دہلی کی سنگلاخ زمینوں پر شرنارتھی بن گئے جہاں وہ سانپ اور بچھوؤں کے ڈسنے سے مرنے لگے اور ناقابل برداشت گرمی سے بے ہوش ہونے لگے۔ وہ ریفوجی کیمپوں میں رہنے کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونے لگے۔ کشمیری پنڈت جو صدیوں سے اپنے مسلم بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے جو آپس میں گھی شکر تھے۔ جنکی نسل ایک تھی جن کی زبان اور کلچر مشترکہ تھا، جو کشمیر کے پشتینی باشندے تھے، اُنھیں کشمیر چھوڑنا پڑا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ 7 لاکھ فوج 3 لاکھ پیرا ملٹری فورس اور مقامی پولیس کے ہوتے ہوئے بھی تین لاکھ سے زیادہ کشمیری پنڈت کشمیر سے ہجرت کر گئے۔ اس ہجرت میں اگر سرکاری رضامندی شامل نہ ہوتی تو جواہر ٹنل سے آگے کسی کو نہ جانے دیا جاتا بلکہ قاضی گنڈ کی سینکڑوں کنال اراضی پر اُن کے کلسٹر بنائے جاتے۔ فوج اُن کو پورا تحفظ دیتی۔ دُنیا کے تمام خطوں میں جہاں طرفین میں جنگ چل رہی ہو یا کسی ملک میں خانہ جنگی ہو تو لوگ جان بچانے کے لئے پُر امن علاقوں کو ہجرت کر جاتے ہیں اور حکومتیں اُن کو نہ فقط تحفظ دیتی ہیں بلکہ اُنھیں ضروریات زندگی بھی مہیا کراتی ہیں۔ مثال کے طور پر جب مشرقی پاکستان میں فوج اور مقامی آزادی پسند لوگوں کے درمیان مسلح جدوجہد چل رہی تھی تو تقریباً ڈیڑھ کروڑ لوگوں کو بھارت نے اپنے ملک میں پناہ دی تھی اور ان کو ہر سہولت بہم پہنچائی تھی۔ اسی طرح جب روس نے افغانستان پر قبضہ کر لیا اور افغانیوں نے ان کے ساتھ کھلی جنگ لڑی تھی تو 40 لاکھ لوگ پاکستان میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ جنکی حفاظت پاکستان نے امریکہ کی مالی مدد سے کی تھی۔ سریا، عراق، یمن، فلسطین، ویت نام

کے علاوہ میانمار (برما) سے ہجرت کرنے والے روہنگیا مسلمانوں کو بنگلہ دیش اور بھارت میں پناہ ملی ہوئی ہے۔ پھر کیا وجہ تھی کہ بھارت تین چار لاکھ کشمیری پنڈتوں کو اُن کی اپنی زمین پر تحفظ نہیں دے سکا۔ آنے والے تاریخ داں اس پر ضرور سوال اٹھائیں گے۔ میری نظر میں کشمیری پنڈت دہشت اور سیاست کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کتنی بدقسمتی کی بات تھی کہ پنڈت برادری اپنے گھر بار، کھیت کھلیان، میوے کے باغات سب چھوڑ کر دیارِ غیر میں بسنے کیلئے مجبور ہو گئے۔ سرکار کی نااہلی کی وجہ سے اُنھیں یہ سب برداشت کرنا پڑا۔

اُس صورتِ حال کیلئے پاکستان کی فوجی قیادت کی حکمت عملی، تربیت یافتہ مسلح ملی ٹینٹوں کو ریاست میں بھیجنا، مقامی نوجوانوں کے مذہبی جذبات بڑھکا کر اُنھیں 15 یا 20 دِن کی ٹریننگ اور ہتھیار دے کر کشمیر میں افراتفری پھیلانے کا کام سونپنا اور بھارتی فوج کا حالات پر قابو نہ پانا، اہم وجوہات ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

کشمیری پنڈتوں کے جانے کے بعد گورنر جگمو ہن کے لئے میدان کھُلا تھا۔ اُس نے جلسے اور جُلوسوں پر گولیاں برسانے کا حکم دیا۔ صرف ایک مہینے میں تقریباً پانچ سو نہتے کشمیری مسلمان اِن جلسوں اور جلوسوں میں مارے گئے۔ فوج، سنٹرل ریزور پولیس اور دیگر سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں نے لوگوں کی نفرت اور غُصے کو مزید بڑھکایا۔ اُن کی ہمدردیاں ملی ٹینٹوں کے تئیں بڑھنے لگیں۔ وہ اُنھیں ہیرو سمجھنے لگے۔ گاؤ کدل، بجبہاڑہ، سوپور، پٹن اور بڈگام کے جلوسوں میں شرکت کرنے والے نہتے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔ یہاں تک کہ میرواعظ مولوی فاروق کے جنازے کے جلوس پر بارڈر سیکورٹی فورس اور سی، آر، پی، ایف کے جوانوں نے فائرنگ کرنے کی حماقت کی۔ حالانکہ مولوی فاروق کو ملی ٹینٹوں نے ہندوستانی ایجنٹ ہونے کے شک میں مار دیا تھا۔ ان کا قاتل آج بھی سنٹرل جیل سرینگر میں بند ہے۔ لیکن اس واقعے کی وجہ سے لوگوں نے مولوی فاروق کے قتل کے لئے بھی گورنر جگموہن اور سیکورٹی کے جوانوں کو ذمے دار قرار دیا۔ کشمیر میں عوامی بغاوت کو دبانے کے لئے فوج نے کئی غیر انسانی کام کئے۔ جن میں عورتوں کی عصمت دری بھی شامل ہے۔ جس کا ثبوت کُنن پوش پورہ کا سانحہ ہے جہاں تلاشی مہم کی آڑ میں 50 سے زائد عورتوں کی عصمت کو تار تار کر دیا گیا۔ فوج نے 22 عورتوں کے ساتھ ہوئی زیادتی کو تسلیم کیا اور فوجی مجرموں کا کورٹ مارشل بھی کیا۔ ملی ٹینوں کی زیادتیاں بھی کم نہیں تھیں۔ وہ بے گناہ ہندوؤں کو قتل کرنے لگے، بھارت نواز مسلمانوں کو مارنے لگے۔ اُن کا اغوا کرنے لگے۔ غرض کشمیری عوام دو دھاری تلوار کا شکار ہوئے۔ بین الاقوامی سطح پر کشمیر

کیحالات پر جب آوازیں اُٹھنے لگیں اور کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی پر لعن طعن ہونے لگی تو گورنر جگموہن کو واپس دہلی بُلا لیا گیا اور اُس کی جگہ 'را' کے سابقہ سربراہ گریش سکسینہ کو گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ جس نے اپنی حکمت علی اور تجربہ کاری سے ملی ٹینسی پر بہت حد تک روک لگائی۔

1990ء میں جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کا وادی کشمیر میں بہت زیادہ اثر تھا۔ وہ اپنی سرگرمیوں کو جموں خطہ تک بڑھانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے اُنہوں نے جموں صوبہ کے مسلم اکثریتی علاقوں میں جے، کے، ایل، ایف کے مراکز بنالئے تھے جو وہاں کاروائیاں کررہے تھے لیکن جموں کے ہندو اکثریتی علاقوں میں بھی وہ اپنا جال بچھانا چاہتے تھے جس کے لئے اُنہوں نے جموں کے ایک جوشیلے نوجوان کاکا حسین کو چُنا۔ اُسے جموں کا ایریا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ جے، کے، ایل، ایف کی تنظیم بنائے۔ کم عمر اور ناسمجھ مسلم لڑکوں کو بھرتی کرے۔ اُنھیں ہتھیار چلانے کی تربیت دے اور پھر جموں میں وارداتیں کرے۔ کاکا حسین نے دس بارہ کم سِن بچوں کی جماعت بنائی اور گوجرنگر کے قبرستان میں اُن کو اے، کے 47 بندوق چلانے کی تربیت دینے لگا۔ اُنہی دِنوں جموں میں انتہا پسند ہندو لڑکوں نے تالاب کھٹیکاں کے مسلم دُکانداروں پر حملہ کردیا۔ کاکا حسین اپنے کچھ دوستوں اور دُکانداروں کے ساتھ اُن پر جوابی حملہ آور ہوا۔ اُس نے دو تین لڑکوں پر قصائی کے ٹوکے سے وار کیا اور وہ لوگ بھاگ گئے۔ اس واردات نے کچے ذہن کے ان بچوں کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ وہ کاکا حسین کو مسلمانوں کا ہیرو سمجھنے لگے۔ متاثر ہونے والوں میں خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین بھی تھا۔ وہ بھی کاکا حسین کی جماعت میں شامل ہوگیا یہ سب نوعمر لڑکے گوجرنگر قبرستان میں جاتے۔ کاکا حسین اِن کو غازیوں کے سچے جھوٹے قِصے سناتا جبکہ وہ خود کورا اَن پڑھ تھا۔ بندوق چلانی سِکھاتا۔ پھر اُس نے کوئی واردات کرنے کے لئے بچوں کو تیار کیا۔ ذاکر حسین سب سے کم عمر تھا۔ وہ اُس وقت 15 سال کا تھا اور میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔ اُسے کار چلانے کا شوق تھا۔ خالد صاحب کے سرکاری ڈرائیور کلبھوشن سنگھ نے اُسے کار چلانا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ کاکا حسین نے اُس کی ڈیوٹی یہ لگائی کہ وہ اُس کی ماروتی وین کے شیشوں پر کالی فلم لگوا کر لائے۔ ذاکر حسین ماروتی وین کو جموں کی سڑکوں پر خوب گھماتا رہا اور پھر کالی فلم لگوا کر وین کاکا حسین کے سپرد کرکے اپنے گھر آ گیا۔ دوسرے دِن کاکا حسین نے گمٹ چوک میں ایک ویشنو ڈھابے پر اندھا دھند گولیاں چلائیں۔ اُس کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے۔ اس حادثے میں دو آدمی مارے گئے اور ڈھابے کے مالک سمیت کچھ لوگ زخمی ہوگئے۔ کاکا حسین اس واردات کے بعد گاندھی نگر کی طرف بھاگا۔ وہاں اُس نے ایک

گلی میں ماروتی وین کھڑی کر دی۔ وہ اور اس کے ساتھی الگ الگ سمت میں بھاگ گئے۔ اگلی صبح سبھی اخباروں میں واردات کی خبر شہ سرخیوں میں چھپی تھی۔ پولیس نے ماروتی وین ضبط کر لی اور حادثے کی تحقیقات کرنے لگی۔ پولیس کو پتہ چل گیا کہ واردات سے ایک روز پہلے خالد حسین کا بیٹا ذاکر حسین ضبط شدہ ماروتی وین چلا رہا تھا۔ ذاکر کے کچھ دوستوں نے اُسے بتا دیا کہ پولیس اُسے ڈھونڈ رہی ہے ۔ کیونکہ اُن لوگوں نے جو واردات کی ہے وہ اسی وین سے کی گئی ہے۔ جسے وہ چلا رہا تھا۔ ذاکر حسین نے جب یہ سُنا تو وہ گھر سے بھاگ گیا۔ ذاکر کی گم شدگی کی خبر سن کر جب خالد حسین پونچھ سے جموں پہنچے تو گھر میں ماتم کا ماحول تھا۔ ذاکر کی ماں اور بہنوں نے رو رو کر بُرا حال کیا تھا۔ خالد حسین نے سب کو دم دلاسا دیا اور ذاکر حسین کا پتہ لگانے کیلئے ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں اُس کے روپوش ہونے کی اُمید تھی۔ لیکن کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اتنا پتہ ضرور چل گیا کہ کاکا حسین نے معصوم ذاکر اور دوسرے کئی کم سن بچوں کی زندگی برباد کر دی ہے۔ خالد حسین واپس پونچھ چلا گیا۔ پھر ایک آدھ مہینے کے بعد کاکا حسین سرینگر میں گرفتار ہو گیا۔ تفتیش میں اُس نے سبھی لڑکوں کے نام بتا دیئے جن میں ذاکر حسین بھی شامل تھا۔ خالد حسین کو متعلقہ پولیس تھانے بُلایا گیا۔ جہاں راجستھان کے رہنے والے ایک اعلیٰ افسر نے اُن کی تفتیش کی۔ جب اُسے خالد حسین کے خاندانی پس منظر کا پتہ چلا اور بطور ضلع افسر اُس کی کارکردگی کا معلوم ہوا تو وہ پوچھنے لگا کہ اتنی اچھی بیک گراؤنڈ کے ہوتے ہوئے ذاکر حسین کیسے ان لوگوں کے چُنگل میں پھنس گیا۔ تو خالد صاحب کا جواب تھا کہ اُن کے گھر میں تعلیم کا ماحول ہے۔ اُن کے بچے پرائیویٹ سکولوں میں پڑھے ہیں ذاکر بھی دیوان بدری ناتھ شکھشا ودیالیہ میں دسویں تک پڑھا۔ وہاں اُسے کون سی تعلیم دی جاتی رہی، شاید مسلم اقلیت کے ساتھ ناروا سلوک اور حقارت بھی ایک وجہ ہو ورنہ قوم پرست اور بھارتی سنسکرتی کا دعویٰ کرنے والے ان اداروں میں پڑھ کر بھی کوئی کیسے منفی سوچ رکھ سکتا ہے۔ دراصل ذاکر حسین نے اُن کی سوچ پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ تین گھنٹے کی تفتیش کے بعد اُس افسر نے خالد صاحب کو چائے پلائی اور سٹی تھانے کے ایس، ایچ، او اور علاقے کے ڈی، ایس، پی کو تحریری ہدایت دی کہ خالد حسین یا ان کی فیملی کو تنگ نہ کیا جائے اور نہ کبھی خالد صاحب کو تھانے میں بُلایا جائے۔ لیکن اُس کے باوجود سادہ کپڑوں میں پولیس کے سپاہی خالد کے گھر کا طواف کرتے رہتے۔ لیڈی پولیس کی عورتوں بھکاریوں کے بھیس میں گھر کے اندر جا کر جائزہ لیتیں کہ کہیں ذاکر گھر کے اندر ہی نہ چھُپا ہو۔ اکثر وقت بے وقت مکان پر چھاپے مارے جاتے۔ خالد صاحب اور اُن کا اہل خانہ نفسیاتی بیماری کا شکار ہو گئے۔ وہ رات کو اُٹھ

بیٹھتے اور بیگم کے پوچھنے پر بتاتے کہ کسی نے گیٹ کی بیل بجائی ہے۔ وہ باہر جاتے لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ گوجرنگر کے اُس آسیب زدہ مکان میں گھر کے کسی بھی فرد کو سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ گوجر نگر کالونی میں ایک دوسرے کو لوگ کم ہی جانتے تھے۔ لمبی داڑھیاں، ہاتھ میں تسبیح اوعجیب وغریب لباس اور نمازوں پر زور، لیکن اندر سے کون مخبر ہے اور کون مجاہد۔ اللہ ہی جانے۔

یہ سب باتیں مجھے خالد حسین صاحب نے خود سنائی تھیں۔ جب وہ پونچھ سے تبدیل ہوکر 1991ء کے شروع میں دوبارہ ضلع ڈوڈہ میں اے، سی، ڈی، تعینات ہوئے تھے۔ میرا نام اختر حسین گتُو ہے۔ میں اُن کا قابلِ بھروسہ اہل کار تھا۔ اُنہوں نے ہی مجھے سارا دفتری کام سِکھایا تھا۔ وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور روز شام کو مجھے اپنے سرکاری کوارٹر میں بُلاتے اور اپنا من ہلکا کرتے۔ اُن دِنوں ڈوڈہ میں حیدرآباد کے رہنے والے ایک اعلیٰ ظرف آئی، پی، ایس افسر مسٹر ایلنکو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس تعینات تھے۔ ہنس مُکھ طبیعت، بااخلاق اور ادب نواز انسان۔ خالد حسین صاحب کے ساتھ اُن کی دوستی کی بُنیاد ادبیاتِ عالم کی جانکاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پڑھنے کے لئے کتابیں دیتے۔ کچھ دیر کے بعد ایلنکو کا تبادلہ جموں ہوگیا جہاں وہ ایس، ایس، پی جموں لگائے گئے تھے۔ ایک دِن ایلنکو صاحب کا فون آیا۔ اُنہوں نے خالد صاحب کو فوراً جموں بُلایا تھا۔ وہ ذاکر حسین کے بارے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ خالد حسین جموں پہنچے اور ایلنکو صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع دی تو اُنہوں نے دوسری صبح ناشتے پر خالد صاحب کو بُلایا۔ وہاں مسٹر ایلنکو نے بتایا کہ ذاکر حسین جموں میں ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ اُن کے دوست کا بیٹا مارا جائے۔ اس لئے اُسے وہ سرنڈر کرائیں۔ ورنہ پولیس مقابلے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ خالد حسین نے گھر آکر اُس کے قریبی دوستوں کو بُلایا۔ جن میں محمد ایوب تیلی بھی تھا۔ خالد صاحب نے ایوب کو ساری بات سمجھائی اور کہا کہ وہ ذاکر کو سرنڈر کرنے پر مجبور کرے۔ شام کو ایوب نے ذاکر کا پیغام دیا کہ پولیس کے آگے سرنڈر کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اُس کی تنظیم کے ملی ٹینٹ اُس کے پورے خاندان کو مار ڈالیں گے۔ دوسرے دِن خالد صاحب مسٹر ایلنکو سے ملے اور بتایا کہ وہ سرنڈر کرنے کو تیار نہیں ہے کیونکہ اُسے ڈر ہے کہ ملی ٹینٹ اُس کے اہل خانہ کو مار ڈالیں گے۔ مسٹر ایلنکو نے خالد صاحب کو کہا کہ اب سب خدا پر چھوڑتے ہیں آپ واپس اپنی ڈیوٹی پر چلے جائیں۔ خالد حسین واپس ڈوڈہ آگئے لیکن بے چین رہنے لگے۔

کچھ دِنوں کے بعد پروجیکٹ افسر ڈی، آر، ڈی، اے، چوہدری محمد اسلم کے ساتھ خالد حسین بانہال

کے دورۂ پر گئے۔رات خالد صاحب اور اسلم صاحب ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔آدھی رات کے بعد یعنی کوئی تین بجے کے قریب خالد حسین اُٹھ کر بیٹھ گئے اور محمد اسلم صاحب سے کہنے لگے کہ ذاکر حسین کو کسی نے گولی ماردی ہے وہ مر گیا ہے۔اُس کا جنازہ پڑھنا ہے۔اُس کو دفنانا ہے۔جلدی کرو۔ اور چلو۔محمد اسلم نے اُنھیں سنبھالا اور کہا کہ اُنہوں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔صبح چلتے ہیں۔رات کا وقت ہے۔باہر برف باری ہورہی ہے۔ناشری نالہ بند ہے۔رام سو میں بھی پسیاں گری ہوں گی۔دوسرے کمرے سے میں اور اسلم صاحب کا اے، پی، او تصدق جیلانی (جو کہ بعد میں ڈائریکٹر رورل ڈیولپمنٹ اور ڈپٹی کمشنر رہا اور بعد ازاں کورونا کی وجہ سے سب کو چھوڑ کر داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گیا) بھی اُن کے کمرے میں آ گئے۔ہم سبھی خالد صاحب کو دلاسہ دیتے رہے۔دوسرے دن خالد حسین اور محمد اسلم جموں چلے گئے اور ہم ڈوڈہ۔ جب خالد صاحب اپنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ پورے گوجر نگر کو پیرا ملٹری فورس اور ریاستی پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ٹھیک رات کے بارہ بجے مسٹر ایلنکو (جو بعد میں R.A.W میں ایک بڑے عہدہ پر رہ کر ریٹائر ہو گئے) اور ایس پی شیش پال وید (جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل پولیس بنے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں) خالد صاحب کے گھر کے اندر داخل ہوئے۔اُن کے ساتھ کچھ سپاہی بھی تھے مِسٹر ایلنکو چھت پر چڑھ گئے۔اور ایس، پی وید خالد صاحب سے باتیں کرنے لگے۔اتنے میں چھت پر سے آوازیں آنے لگیں۔ساتھ والے مکان میں بہت شور تھا۔پولیس کے جوان ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔بغل والا مکان کشتواڑ کے محمد اقبال شیخ کا تھا اور اُس کی بیوی پروین اختر اپنے بچوں کے ساتھ وہاں رہتی تھی۔اُسی گھر سے پولیس نے ذاکر کو پکڑا تھا۔ذاکر کو اُس وقت کے ڈی، ایس پی (جو بعد میں آئی، جی، پی ریٹائر ہوئے اور پھر لکشدیپ کے ایڈمنسٹریٹر اور جموں کشمیر گورنر کے ایڈوائزر بنے) سردار فاروق خان نے قابو کیا تھا۔فاروق خان صاحب کی والدہ ماجدہ محترمہ خالدہ بیگم خالد حسین کے والد ماسٹر غلام حسین کی شاگرد تھیں اور اُن کا تعلق بھی ادھم پور سے تھا۔خالد صاحب اور فاروق صاحب بھی گہرے دوست تھے۔ذاکر حسین کو پکڑ کر گھر لایا گیا اور فاروق صاحب نے اُس کے جُوتے منگوائے کیونکہ وہ ننگے پاؤں تھا۔خالد صاحب نے ذاکر کو پہچانا نہیں تھا کیونکہ جب وہ گھر سے بھاگا تھا تو اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی لیکن اب ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ذاکر حسین کو سب سے پہلے اُس کی بہن ہما تبسم نے پہچانا۔وہ ذاکر حسین کو چھڑانے کے لئے آگے بڑھی۔اُس کی والدہ بھی رونے لگی۔لیکن مسٹر ایلنکو نے اُنھیں یقین دلایا کہ جب تک ذاکر اُن کے پاس ہے، اُسے کسی قسم کی اذیت نہیں دی جائے گی۔مسٹر

ایلنکو نے خالد حسین کو بتایا کہ اُس نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ اگر ذاکر حسین کے پاس ہتھیار رہا اور اُس نے گولی چلائی تو جواباً اُس کی ٹانگ پر گولی چلائی جائے کیونکہ وہ خالد حسین کا بیٹا ہے۔ اور ہمیں وہ زندہ چاہئے۔ پولیس ذاکر کو لے گئی۔ گھر ماتم کدہ بن گیا۔ خالد صاحب کی بیگم، بیٹیاں اور چھوٹے بیٹے یاسر عمران نے رو رو کر اپنا برا حال کر دیا۔ کوئی ہمسایا، کوئی رشتہ دار کوئی دوست دُکھ کی اُس گھڑی میں درد بانٹنے نہیں آیا۔ اُنھیں ڈر تھا کہ خالد حسین کے گھر جانے سے کہیں وہ مصیبت میں نہ پھنس جائیں یہاں تک کہ جس گلی یا سڑک سے خالد صاحب گذرتے، قرابت دار اور دوست احباب وہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف نکل جاتے۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنے اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر وعظ فرمانے والے امام مسجد اور مذہبی ٹھیکیدار کہیں نظر نہیں آئے۔ مسٹر ایلنکو نے اپنا وعدہ نبھایا کیونکہ جب تک ذاکر حسین پولیس کی حراست میں رہا اس پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اُس کیلئے کھانا بھی گھر سے جاتا تھا۔ آٹھویں روز ذاکر حسین کو سٹی تھانے سے نکال تفتیشی مرکز تالاب تلو بھیج دیا گیا۔ انٹروگیشن سنٹر کا انچارج ڈی، ایس، پی مکھن لال شرما تھا۔ جو بڑا خرانٹ، تجربہ کار لیکن سخت مزاج کا شخص تھا۔ وہ بااصول اور پوجا پاٹھی افسر تھا۔ کسی کی سفارش نہیں سنتا تھا چاہے وہ اُس کا سنیئر افسر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی ڈیوٹی فرض سمجھ کر کرتا تھا۔ ملی ٹینٹوں کے لئے وہ ایک دہشت تھا۔ اُس کے سامنے بڑے بڑے عسکری لیڈر بھی طوطے کی طرح بولنا شروع کر دیتے تھے۔ کشمیر کے علیحدگی پسند لیڈروں اور بھارت مخالف طاقتوں کے وہ سخت خلاف تھا۔ اور جو بھی کوئی انٹروگیشن سنٹر میں اُس کے ہتھے چڑھتا وہ مکھن لال شرما کو زندگی بھر نہیں بھولتا۔ 1947ء کی شورش میں اُس کے بھی سگے سمبندھی مسلم بلوائیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے جس کی کسک اُس کے اندر بھی گورنر جگموہن کی طرح زندہ تھی جس کا خاندان بھی لاہور سے ہجرت کر کے دہلی میں آباد ہوا تھا۔ ذاکر حسین کو تفتیشی مرکز میں گئے تقریباً دو مہینے ہو چکے تھے۔ ذاکر کی ماں اور بہنیں اُسے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھیں۔ آخر مجبور ہو کر خالد حسین نے اپنے لڑکپن کے دوست ایس، ایس، پی خالد دُرّانی سے ذاکر کو ملنے کے لئے اس کی مدد طلب کی۔ خالد دورانی اُسے پرتھوی راج گنڈوترا سے ملانے لے گئے جو اُس وقت ایس، ایس، پی، سی آئی، ڈی جموں تعینات تھا (بعد میں آئی، جی پی ریٹائر ہوئے) اور مکھن لال شرما اُسی کے ماتحت کام کر رہا تھا۔ دُرّانی صاحب نے پی، آر، گنڈوترا کو ذاکر حسین سے ملاقات کے لئے کہا تو اُس نے ہچکچاتے ہوئے مکھن لال شرما کو فون کیا اور کہا کہ اُس کا بیچ میٹ خالد دُرّانی اور ہمارے مشترکہ دوست خالد حسین آئے ہیں وہ ذاکر حسین سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ذاکر کی ماں اور بہن اُسے دیکھنے

کے لئے بے چین ہیں۔ اگر اس کی تفتیش مکمل ہو چکی ہو تو ملاقات کرا دی جائے۔ مکھن لال شرما نے پہلے تو صاف انکار کر دیا لیکن گنڈوترا صاحب کے نرم لہجہ کی وجہ سے اُس نے آٹھویں دِن ملاقات کا وقت دیا۔ ٹھیک آٹھویں دِن خالد حسین، اُن کی اہلیہ، بیٹی حما تبسم اور بیٹا یاسر عمران انٹروگیشن سنٹر وقت پر پہنچ گئے۔ مکھن لال شرما خالد حسین صاحب سے کڑوا بولنے لگا اور کہنے لگا کہ آپ کے گھروں میں بھارت مخالف اور پاکستان کے حق میں باتیں ہوتی ہیں۔ اِسی لئے آپ کے بچے دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ 1947ء میں اُس کے رشتے دار بھی قبائلی درندوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور پاکستان کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ جواب میں خالد صاحب نے کہا تھا ''اُن کا بھی سارا کنبہ 1947 میں کٹر پنتھی ہندوؤں نے قتل کر دیا تھا۔ دادا، باپ، چاچے، چاچی اُن کا بیٹا، پھوپھا اور دو بھائی، سب مسلمان ہونے کی وجہ سے قتل کر دیئے گئے لیکن اُس قتل و غارت کے لئے وہ ہندوؤں کو ذمے دار نہیں سمجھتے اور نہ ہی مسلمانوں کو کیونکہ ایسے گھنؤنے کام کرنے والے وحشی جانور ہوتے ہیں وہ کسی دھرم کو نہیں مانتے جبکہ دھرم تو ''جیو اور جینے دو'' کا درس دیتا ہے۔ پھر خالد صاحب اور اُن کے پریوار کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد ذاکر حسین کو وہاں لایا گیا۔ ذاکر کی حالت دیکھ کر حما بیٹی بے ہوش ہو گئی۔ اُس کے سارے شریر پر سوجن تھی۔ خاص کر پاؤں بہت سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ اور اُن کے گرد سیاہ ہالے پڑے تھے وہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ دو سپاہیوں نے اُسے سہارا دے کر کمرے کے اندر لایا تھا۔ خالد صاحب کو دیکھتے ہی وہ بلکنے لگا اور گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگا اور تفتیش کرنے والوں کی شکایتیں کرنے لگا کہ انہوں نے ٹکٹکی باندھ کر اُس کی خوب پٹائی کی ہے۔ 15 دن تک سونے نہیں دیا۔ بجلی کے کرنٹ دیئے۔ جُوؤں والے کمرے میں رکھنے اور جسم کھجانے کی وجہ سے زخم صاف دکھائی دے رہے تھے۔ خالد صاحب نے اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے اُسے کہا تھا ''بیٹا! تم غلط صحبت میں پڑ گئے تھے۔ تمہیں اپنے گھر کا لذیذ کھانا اور آرام دہ بستر راس نہیں آیا۔ تم نے کاکا حسین جیسے موالی کو اپنا ہیرو مانا۔ میرے لاکھ سمجھانے کے باوجود تم نے اُس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جس نے تمہارا استعمال کیا۔ تمہیں اپنے باپ کے گھر میں کِس چیز کی کمی تھی۔ تم کو کون سی آزادی چاہئے تھی۔ تمہارا باپ ایک اعلیٰ سرکاری افسر ہے جس نے تم کو ہر آشائش مہیا کی تھی۔ پھر بھی تم کاکا حسین کے بہکاوے میں آ گئے۔ یہ تفتیشی افسر تمہارے انکل ہیں تمہیں اچھا اور برا سمجھانے والے۔ تمہیں سیدھے راستے پر لانے والے۔ اللہ کا شکر کرو کہ تم زندہ ہو۔'' ملاقات کے بعد مکھن لال شرما نے خالد حسین کو اپنے کمرے میں بلایا۔ سب کو قہوہ پلایا اور کہا کہ

ذاکر حسین کی تفتیش مکمل ہوچکی ہے ۔کچھ دنوں تک ذاکر کوعدالتی حراست میں جیل بھیج دیا جائے گا۔اُسی کمرے میں خالد صاحب کوانت ناگ کے حریت لیڈر مولوی نثار بھی ملے (جن کا بعد میں انکاؤنٹر کر دیا گیا تھا) ذاکر حسین پر ''ٹاڈا'' قانون کے تحت ٹاڈا عدالت میں چالان پیش کیا گیا۔ پولیس نے اُس پر جوالزام لگائے تھے،اُن میں یہ اہم تھے۔

1۔وہ ایک خطرناک اُگروادی ہے۔

2۔جے،کے،ایل،ایف تنظیم کا جموں میں ائیر یا کمانڈر ہے۔

3۔فوج پر گرینیڈ پھینکنا،بم بلاسٹ اور قتل وغیرہ

ذاکٹر حسین کو ڈسٹرکٹ جیل جموں میں رکھا گیا۔ذاکر کے ساتھ جو دوسرے لڑکے پکڑے گئے تھے اور جن کا نام چالان میں درج تھا،وہ،ساجد بٹ،خالد چوہدری،محمد اشرف،غلام محمد رنگساز اور پروین اختر تھے۔مقدمہ لڑنے کے لئے خالد صاحب کوکئی مسلم وُکلا کا نام تجویز کیا گیا لیکن اُنہوں نے ایک کشمیری پنڈت بنسی لال چٹہ کوذاکر اور اُس کے ساتھیوں کا وکیل بنایا،جو دیکھنے میں وکیل کم اور باتونی منشی زیادہ لگتا تھا۔وہ بارہ مولہ سے ہجرت کر کے جموں آیا تھا اور مقامی عدالتوں میں وکالت کرنے لگا تھا۔اُس نے چالان اور اُسکے ساتھ نتھی دیگر کاغذات کی کاپیاں حاصل کیں اور عرق ریزی سے اُنھیں پڑھنے لگا تاکہ استغاثہ کی طرف سے کیس تیار کیا جاسکے۔مقدمہ شروع ہوا۔سرکاری وکیل کی طرف سے گواہان اپنے بیان قلمبند کرانے لگے۔بنسی لال چٹہ گواہوں پر جرح کرتا رہا۔عدالتی کاروائی میں چار سال بیت گئے تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی۔اس دوران ذاکر حسین جموں جیل سے سنگرور جیل منتقل کیا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد اُسے جودھ پور جیل میں بھیج دیا گیا۔جودھ پور جیل سے اُس کو مقررہ تاریخ پر عدالت میں حاضر نہیں کیا جاتا۔سرکاری وکیل کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر عدالت سے لمبی لمبی تاریخیں لینے لگا۔جودھ پور جیل میں ذاکر حسین تقریباً ڈیڑھ سال سے قید تھا۔اس عرصہ میں اُسے کبھی پیشی پر جموں نہیں لایا گیا۔اپنی اہلیہ کے اصرار پر خالد صاحب ذاکر کو ملنے جودھ پور گئے۔ان کے دوست سردار عجب سنگھ وزیر نے جموں سے لیکر جودھ پور تک کار چلائی اور گیارہ بارہ سو کلومیٹر کا سفر دودنوں میں طے کیا۔پہلی رات دہلی میں اور دوسری جودھ پور میں گذاری۔ضابطے کے مطابق ذاکر سے ملاقات کے لئے ڈسٹرکٹ جج جودھ پور سے اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا۔اسلئے وہ پہلے عدالت میں گئے۔وہاں ایک سکھ وکیل کو دیکھ کر عجب سنگھ اُن کی طرف دوڑا۔اُسے ساری بات بتائی۔ سِکھ وکیل نے خود درخواست بنائی اور ٹائپ کی۔خالد حسین کے دستخط کروائے اور اُن کو لے کر سیشن جج

کے سامنے پیش ہوگیا۔ جج صاحب نے اجازت نامہ پر دستخط کر دیئے ۔ جب عجب سنگھ نے اُسکے کام کا مختانہ پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ اُسے کیوں شرمندہ کرتے ہو۔ ایک عرصہ کے بعد ایک سکھ بھائی کو دیکھا ہے۔ خالد صاحب اُن کی اہلیہ نسیم فردوس، بیٹی ھما تبسم اور عجب سنگھ جودھ پور جیل گئے۔ خالد حسین نے اپنا شناختی کارڈ اور اجازت نامہ جیلر کے پاس بھیجا۔ اس نے سب کو اپنے کمرے میں بُلایا۔ وہ اپنی کرسی سے اُٹھا خالد صاحب کو سلیوٹ مارا۔ چائے پلا کر عزت افزائی کی اور پھر کہنے لگا کہ اُس نے اپنا پروٹوکول پورا کر دیا ہے۔ اب اُن سب کو باقی ملاقات کرنے والوں کی طرح جیل ضابطے پر عمل کرنا ہوگا۔ جیل کوٹھری سے ذاکر حسین کو لایا گیا۔ آدھا گھنٹہ ملاقات ہوئی ۔ ذاکر کی صحت بہت اچھی تھی ۔ چہرے کا رنگ نکھرا ہوا تھا۔ وہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ اُس وقت اُسی جیل میں ذاکر حسین کے ساتھ مشتاق لٹرم، نعیم خان، بٹہ کراٹے، مشتاق السلام، عمران الٰہی (جو بعد میں ایم ،ایل ،سی بنایا گیا) عبدالسلام راتھر وغیرہ کئی دوسرے علیحدگی پسند لیڈر بھی قید تھے۔ دوسری رات بھی اُنہوں نے جودھ پور کے ہوٹل میں گذاری۔ پھر وہ اجمیر آئے اور حضرت معین الدین چشتی کی درگاہ پر حاضری دی۔ دہلی پہنچنے پر اُنہوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھی اور ذاکر کی رہائی کے لئے دعائیں مانگیں۔ درگاہ سے باہر خالد صاحب نے تقریباً ایک سو فقیروں کو کھانا کھلایا کیونکہ جموں میں کسی جیوتشی نے خالد حسین سے کہا تھا کہ فقیروں اور حاجت مندوں کو کھانا کھلانے سے ذاکر کے گرہ ماند پڑ جائیں گے۔ اگلے روز وہ لوگ جموں واپس آ گئے ۔ جموں آنے کے بعد بھی خالد صاحب ہر جمعرات کو ستواری والے پیر بابا بڈھن شاہ کی درگاہ اور رام نگر کے موڑوں میں واقع پنج پیر کی درگاہ پر حاضری دیتے اور فقیروں میں کھانا اور پیسے بانٹتے (پنج پیر زیارت کا ذکر قدرت اللہ شہاب نے اپنی آپ بیتی ''شہاب نامہ'' میں کیا ہے) اس کے علاوہ وہ گمٹ میں نوگزیئے پیر کی درگاہ اور رگھوناتھ مندر کے باہر مانگنے والوں میں پیسے بانٹتے ۔ اپنی اولاد کی چاہت میں انسان کیا کیا نہیں کرتا۔ کہاں کہاں ماتھا نہیں رگڑتا۔ چاہے وہ ان باتوں کو شرک سمجھتا ہو لیکن جب نصیبوں کی مار پڑتی ہے تو عقل و دانش کے دروازے بند ہوجاتے ہیں ۔ اُن ہی دِنوں خالد حسین کی پوسٹنگ اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں بحیثیت ڈپٹی ڈائریکٹر اسٹیٹ جموں ہوئی۔ اس دفتر میں ایک مہاجر کشمیری پنڈت (جس کے والدین اننت ناگ کے بڑے زمیندار تھے) ڈیلی ویجر کے طور پر کام کرتا تھا۔ اُس کا نام وجے کمار کول تھا۔ اخباروں اور دیگر قریبی ذرائع سے اُسے خالد حسین کی پریشانی کے بارے میں علم تھا۔ ایک دن وہ خالد صاحب سے کہنے لگا کہ ذاکر کو جودھ پور سے جموں لانے کے سلسلے میں وہ اُن کی مدد کر سکتا ہے۔

کیونکہ اُس کے خالہ زاد بھائی شری ترکولی ناتھ بٹ ٹاڈاٹ کورٹ کے جج ہیں۔ وہ اُن سے ملاقات کراسکتا ہے۔ خالد صاحب نے بے دِلی سے اُسے کہا کہ اگر وہ کوشش کرسکتا ہے تو کرے، پھر ایک دِن وجے کمار کول خالد صاحب کو شیشن جج ترلوکی ناتھ بٹ صاحب کے گھر لے گیا۔ وہاں خالد صاحب نے ذاکر حسین سے متعلق ساری روداد سنائی اور گذارش کی کہ وہ ذاکر کو جموں ڈسٹرکٹ جیل یا کوٹ بھلوال جیل میں منتقل کرائیں کیونکہ بار بار جودھ پور نہیں جایا جاسکتا۔ جج صاحب نے دوسرے دِن داخلہ امور کے کمشنر جناب محمود الرحمن (جو بعد ازاں علی گڑھ مسلم نیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور اب وفات پا چکے ہیں) کو ایک سخت چٹھی لکھی اور وضاحت مانگی کہ ذاکر حسین کو کس کی اجاازت سے جودھ پور جیل میں رکھا گیا ہے۔ جبکہ وہ اُن کی عدالتی حراست میں تھا اور اُن کی پیشگی منظوری کے بغیر اُسے کہیں نہیں لے جایا جاسکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلی کئی تاریخوں میں وہ عدالت میں حاضر نہیں ہوسکا۔ اُنہوں نے ذاکر کو اگلی پیشی پر حاضر کرنے کی ہدایت کی اور وارننگ دی کہ اگر آئندہ پیشی پر ذاکر حسین کو عدالت میں حاضر نہیں کیا گیا تو وہ اُس کے خلاف سارے کیس خارج کر کے اُس کی رہائی کا حکم صادر کردیں گے۔ اس چٹھی نے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہلچل مچادی۔ خفیہ ایجنسیاں حرکت میں آگئیں اور یوں ذاکر حسین ڈیڑھ سال کے بعد ڈسٹرکٹ جیل امپھلا جموں لایا گیا، جودھ پور جیل میں جیلر نے ذاکر حسین کو اسلامی کتب اور قرآن مجید معہ اردو ترجمہ پڑھنے کو دیا اور خود بھی اُس کی برین واشنگ کرتا رہا۔ جودھ پور جیل میں ذاکر حسین کو آزادی کے نام نہاد متوالوں اور حریت کے لیڈروں کو بڑے قریب سے جاننے کا موقع ملا اور وہ اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ ان کے قول وفعل میں کتنا تضاد ہے۔ وہ لوگ بھارت اور پاکستان کی ایجنسیوں سے پیسے لیتے تھے۔ پاکستانی سرکار کشمیر کے لوگوں کو ہندوستانی تسلط کے خلاف بھڑکانے اور آزادی کی تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے اور ہندوستانی حکومت آزادی کی تحریک کو دبانے کے لئے افراطِ زر خرچ کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے آزادی کے ان پروانوں نے کروڑوں روپئے کی جائیداد بنائی تھی (ان لیڈران کو رقم دینے کا انکشاف ''را'' کے سابقہ چیف سری امرسنگھ دُلت نے اپنی کتاب "Kashmir: The Vajpaye's years" میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ جس کی کسی نے تردید نہیں کی) ان لیڈروں کی کرتوتیں دیکھ کر ذاکر حسین کا سارا جوش ولولہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ ان لیڈروں سے ملنے سپریم کورٹ کے وکیل معروف صحافی اور آئی، بی و دیگر خفیہ ایجنسیوں کے افسران اکثر آتے۔ ڈسٹرکٹ جیل امپھلا میں اُن دِنوں سید علی شاہ گیلانی، شبیر شاہ، جاوید میر المعروف جاوید نکا بھی مقیم تھے۔ زیادہ ملاقاتیں ''الجہاد'' تنظیم کے چیف شبیر شاہ سے

ہوتیں۔مرکزی سرکار کے ایلچی جیل میں اُن سے ملتے رہتے۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شبیر شاہ کو وزیر اعلیٰ بنانے کا جھانسہ دیا گیا (تفصیل Kashmir: The vajpayec years) اُسے رہا کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ جیل امپھلا تا ''مانسر ہوٹل'' جموں تک اُس کا استقبال کرایا گیا۔کھلی جیپ میں اُسے بٹھایا گیا اور غلام محمد رنگساز (جو ذاکر کے ساتھ گرفتار ہوا تھا) سے نعرے لگوائے جارہے تھے،''لیڈر ہمارا شبیر شاہ۔اُس وقت بھارت کے وزیر اعظم دیوگوڑا جی تھے۔اُن کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا تھا، اُس کے مطابق ''الجہاد'' تنظیم توڑ دی گئی۔تنظیم کے عہدے داروں اور شبیر شاہ کے قریبی ساتھیوں کی احسن طریقے سے بحالی (Rehablitate) کی گئی چنانچہ سمجھوتے کے تحت ''الجہاد'' کے عسکری کمانڈر بابر بدر (فردوس بابا) غلام نبی شاہ کو ممبر لجسلیٹو کونسل بنادیا گیا۔شبیر وانی اور دوسرے کئی ممبران کو ٹرانسپورٹ کے رُوٹ پرمٹ اور کاروبار کیلئے امدادی رقم فراہم کی گئی۔جیل سے باہر نکلتے ہی شبیر شاہ نے کٹھوعہ سے عوامی جلسے کرنے شروع کئے۔پونچھ، راجوری، اُودھم پور اضلاع کا دورہ کر کے جب وہ بانہال پہنچے تو لوگوں کی نبض دیکھ کر اقتدار کے غبارے کی آدھی ہوا نکل گئی۔باقی ماندہ ہوا جواہر سرنگ کو پار کر کے وادیٔ کشمیر میں داخل ہوتے ہی اُڑن چھُو ہوگئی۔لوگوں نے غدار کہنا شروع کر دیا۔اور شبیر شاہ نے اپنا بیان تبدیل کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ کشمیر مسئلہ کے تین فریق ہیں۔بھارت، پاکستان اور کشمیری عوام۔''ضمیر کا قیدی'' کے خطاب سے نوازے گئے شبیر شاہ صاحب کروڑ پتی بن گئے۔انکم ٹیکس کے گوشوارے میں اُنہوں نے خود اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا تخمینہ سات کروڑ روپئے بتایا تھا۔پیسے کی تقسیم کی وجہ سے ہی نعیم خان اور شبیر شاہ کے درمیان جھگڑا ہوا اور نعیم خان اُن سے علیحدہ ہوگیا۔کسی نے بھی یہ جانچ کرنا گوارہ نہ کیا کہ ان لیڈران کے پاس یہ رقم کہاں سے آئی جب کہ یہ سبھی لوگ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔نہ مرکزی سرکار اور نہ ہی ریاستی سرکار نے اس طرف کوئی توجہ دی۔لیکن 2014 کے بعد بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ان سب کو جیل میں ڈالا ہے اور منی لانڈرنگ کی تفتیش ہورہی ہے لیکن سابقہ تجربات کی بنا پر یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ پھر کوئی باہمی مفاہمت ہوجائے اور نئی حکومت بھی پرانی روش پر چل پڑے جیسا کہ سجاد لون کے معاملہ میں ہوا۔

ایک دِن جب خالد صاحب ذاکر حسین کو ملنے امپھلا جیل گئے تو اُنھیں وہاں آئی، بی، کا ایک ڈی، ایس، پی ملا جو پونچھ میں اُن کی پوسٹنگ کے وقت تعینات تھا، علیک سلیک کے بعد اُس نے ذاکر کے بارے میں پوچھا تو خالد صاحب نے کہا کہ وہ اُسی سے ملنے جیل میں آئے ہیں۔جب خالد صاحب

نے دریافت کیا کہ وہ یہاں کس مقصد کیلئے آئے ہیں تو اس نے کہا کہ اُن کے ڈپٹی ڈائریکٹر (ڈی،آئی ،جی) جاوید میر المعروف جاوید نلکا سے جیلر کے کمرے میں ملاقات کر رہے ہیں۔جاوید میر اپنے چھ ساتھیوں کی رہائی کے لئے کہہ رہا ہے۔آپ بھی میر صاحب سے کہیں کہ وہ ذاکر کا نام بھی دے۔خالد صاحب جیلر کے کمرے میں گئے۔جاوید میر نے اُنھیں سلام کیا۔اس سے پہلے کہ خالد حسین جاوید سے کچھ کہتے ،ذاکر حسین آ گیا جب خالد صاحب نے ذاکر سے بات کی تو اُس نے سختی سے منع کر دیا اور کہا کہ ہرگز نہیں۔ وہ اِن لوگوں کی سفارش پر باہر نہیں آنا چاہتا۔سب بِکے ہوئے لوگ ہیں۔آپ عدالتی کاروائی میں تیزی کروائیں۔اورعدالت سے اُس کی ضمانت کرائیں۔ اُنہی دِنوں بھارت سرکار نے کئی علیحدگی پسند اور مجاہدین کمانڈروں کوخرید لیا تھا۔کوکا پرے اورعثمان مجید کوفوج کے بل بوتے پر الیکشن لڑوایا گیا۔ایک منسٹر بن گیا اور دوسرا ممبر اسمبلی کوکا پرے کی بیٹی کی شادی میں فوج اورخفیہ ایجنسیوں کے اعلیٰ افراد اور مقامی انتظامیہ کے لوگ شامل ہوئے۔آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے یہ اصلی چہرے تھے۔ذاکر حسین اِن لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا جنہوں نے اُس کی زندگی خراب کر دی تھی۔

ٹاڈا عدالت میں مقدمہ چلتا رہا،کشمیری پنڈت وکیل بنسی لال چڈھ ہر پیشی پر اپنے دلائل دیتا رہا۔اُدھر خالد حسین مجاز افسران سے ذاکر کی رہائی کے لئے ملاقاتیں کرتے رہے۔ریاستی سرکار نے معمولی جُرم کرنے والے نوجوانوں کی رہائی کے لئے ایک سکریننگ کمیٹی بنائی تھی۔جس میں ریسرچ اینڈ انیلائسس ونگ(R.A.W) انٹلی جنس بیرو(I.B) سرحدی حفاظتی پولیس،ملٹری انٹلی جنس،ریاستی سی آئی ڈی کے علاوہ ریاسی انتظامیہ سے محترمہ سُشما چوہدری (ریاست کی پہلی خاتون آئی،اے،ایس افسر) اور غلام محمد ٹھاکر شامل تھے۔سیشن جج ترلوکی ناتھ بٹ کی تبدیلی کسی اورعدالت میں ہوگئی تھی اور اُن کی جگہ مرحوم سردار مہندر سنگھ ٹاڈا عدالت کے جج تعینات ہوئے تھے۔اُنہوں نے تین چار پیشیوں کے بعد ذاکر حسین اور اُس مقدمے میں ملوث تین دوسرے ملزموں کو ضمانت دے دی۔لیکن سکریننگ کمیٹی ذاکر کی رہائی کے خلاف تھی۔ایک ایسی ہی میٹنگ میں مِس سُشما چوہدری جی نے ذاکر حسین کی رہائی کے لئے زورداروکالت کی اور کہا کہ پندرہ سولہ سال کی عمر میں گرفتار ہونے والا لڑکا کیسے خُونخوار ملی ٹینٹ ہوسکتا ہے۔ایجنسیوں کے الزامات سراسر غلط ہیں اور وہ خالد حسین کا بیٹا ہے جو ریاست کا ایک نامور ادیب ہے۔وہ اُسے ذاتی طور پر جانتی ہیں۔کیونکہ خالد نے اُس کے ماتحت کام کیا ہے۔لہٰذا اُس کی رہائی کے لئے اڑچنیں نہ ڈالی جائیں۔کمشنر غلام محمد ٹھاکر نے بھی محترمہ

چوہدری کی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے اُس کی رہائی کی مانگ کی۔فیصلہ اگلی میٹنگ تک کے لئے ٹال دیا گیا۔اسی دوران خالد صاحب کے دوست اور آئی،اے،ایس،افسر شری سُدھیر سنگھ بلوریا(جواُس وقت محکمہ داخلہ کے کمشنر تھے اور بعدازاں چیف سیکریٹری اور سنٹرل یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے)نے انسپکٹر جنرل پولیس سی،آئی،ڈی شری گوپال شرما آئی،پی ایس(جو بعد میں ڈائریکٹر جنرل پولیس بنے)کو ذاکر حسین کی مِسل دی اور کہا کہ سکریننگ کمیٹی کی ہونے والی میٹنگ میں ذاکر کی رہائی ہوجانی چاہئے کیونکہ عدالت نے اس کو ضمانت دے دی ہے۔شری گوپال شرما نے بھی میٹنگ میں ممبران کے شکوک دور کئے اور ذاکر حسین کی مشروط رہائی کی منظوری دے دی گئی۔شرط یہ لگائی گئی کہ یا تو ذاکر کو پڑھائی کے لئے بیرون ریاست بھیجا جائے (کیونکہ اُس نے ہائرسیکنڈری (12ویں جماعت) کا امتحان اور بی،اے دوئم کا امتحان جیل میں ہی پاس کرلیا تھا) یا پھر اُس کی شادی کردی جائے۔اس طرح 3 نومبر 1995 کو ذاکر حسین ضمانت پر گھر آ گیا۔بنسی لال چٹہ ایک درویش صفت کشمیری پنڈت تھا۔اُس نے کئی بے گناہ کشمیری نوجوانوں کا کیس لڑا اور اُنھیں رہائی دلائی۔وہ پیسے کا لالچی نہیں تھا، بلکہ کئی نادار والدین کے بچوں کا کیس اُس نے مفت لڑا۔ ذاکر حسین اور اُس کے ساتھیوں کا کیس بھی وہ جانفشانی سے لڑ رہا تھا۔اُس نے کبھی پیسے کا تقاضا نہیں کیا۔جو بھی رقم دی گئی وہ خوشی سے قبول کی۔خالد حسین کی نظر میں وہ ایک کرم یوگی تھا۔ذاکر کی رہائی کی خبر بھی سب سے پہلے اُسی نے خالد کو دی تھی اور وہی ذاکر حسین کو گھر لے کر آیا تھا۔ٹاڈا کورٹ میں ذاکر حسین کا کیس لمبے عرصہ تک چلتا رہا لیکن بی،ایل،چٹہ ہر پیشی پر حاضر ہوتا رہا۔سرکاری وکیل اور سرکاری گواہ اُس کی جرح اور دلائل کے آگے ٹِک نہیں سکے اور بالآخر ذاکر سارے الزامات سے بری ہوگیا۔ذاکر حسین کے بری ہونے کا سہرہ صرف اور صرف اُس کے وکیل بنسی لال چٹہ کو جاتا ہے۔آج وہ اس دُنیا میں نہیں ہے لیکن وہ سب لوگ اُس کی آتما کی شانتی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں جن کو چٹہ صاحب نے نئی زندگی دی۔خیر رہائی کے بعد رشتے دار اور دوست احباب مبارک دینے کیلئے آنے لگے، چند روز گہما گہمی رہی۔خالد نے ذاکر سے پوچھا کہ کیا وہ پڑھنا چاہتا ہے یا شادی کرنا چاہتا ہے۔ذاکر حسین نے پڑھنے سے صاف انکار کردیا لیکن شادی کے لئے وہ تیار ہوگیا۔دونوں میاں بیوی رشتے داروں کے پاس جانے لگے لیکن کوئی بھی تیار نہ ہوا۔اُنھیں خدشہ تھا کہ کہیں ذاکر میاں دوبارہ اُسی ڈگر پر نہ چل پڑے۔آخر مالیر کوٹلہ کے سید بشیر شاہ کی بیٹی سے رشتے کی بات کی گئی تو وہ کہنے لگا کہ آپ کی بیٹی ہے جب چاہیں بارات لے کر آجائیں۔ پندرہ دِنوں کے اندر ہی ذاکر حسین کی شادی ہوگئی۔ایس

،ایس بلور یا اپنے پریوار کے ساتھ شادی میں شامل ہوئے ۔ خالد کے ایک اور دوست ڈی آئی جی جموں انوپ سنگھ اور دیگر وہ سبھی لوگ شامل ہوئے جو مصیبت کی گھڑی میں خالد کے ساتھ جُڑے رہے ۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اُن پانچ سالوں میں جو ذاکر نے جیل میں کاٹے ، کسی بھی سرکاری ادارے ، پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی نے خالد حسین کو ، تنگ نہیں کیا ۔ اُس کی پرموشن نہیں رکی بلکہ اچھی سے اچھی پوسٹ پر اُس کو تعینات کیا گیا ۔ وہ ایڈیشنل رجسٹرار کوا پریٹو صوبہ جموں بنا ۔ ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر جموں بنا ، ایڈمنسٹریٹر اوقاف جموں رہا ، اور بحیثیت ڈپٹی کمشنر پونچھ بھی اپنے فرائض ادا کرتا رہا ۔

دُکھاں دی روٹی ، سُولاں دا سالن ، آہیں دا بالن بال
مائے نی میں کینوں آکھاں دردِ وچھوڑے دا حال
(شاہ حسین)

ترجمہ:

دکھُوں کی روٹی ، کانٹوں کا سالن ، آہُوں کا بالن بال
ماں میں کِس کو سناؤں درد جُدائی کا حال

رہے نام سائیں کا
Rahe Naam Saain Ka

انسان درندوں کی طرح گھوم رہے ہیں
شہروں کی طرح کوئی بھی جنگل نہیں دیکھا (نامعلوم)

1990ء میں جب ملی ٹینسی زوروں پر تھی تو وادیٔ کشمیر کے شوپیاں اور پلوامہ کے 34 پڑھے لکھے نوجوان اسلحہ چلانے کی تربیت حاصل کرنے کے لئے ضلع پونچھ کے علاقے ساوجیاں اور گگریاں اور جمیا گلی کے راستے گائیڈ کی مدد سے پاکستانی انتظام والے کشمیر چلے گئے تھے۔ اُن لڑکوں کے گائیڈ کا نام غلام رسول تِتر وگوجر تھا۔ تِتر وکو بھارتی فوج کی راشٹریہ رائفل کے کرنل نے خرید لیا تھا اور وہ فوج کا بھی مخبر بن گیا تھا۔ فوج کی بٹالین منڈی میں مقیم تھی۔ ٹریننگ لینے کے بعد جب وہ نوجوان واپس آنے لگے تو اُن کے کمانڈر نے وائرلیس کے ذریعے تِتر وگوجر سے رابطہ کیا تِتر و نے اُن کو جمیا گلی کے جنگل میں ایک مخصوص جگہ پر اُس کا انتظار کرنے کو کہا اور خود منڈی میں آرمی کرنل سے ملا اور اُن کے آنے کی خبر دی۔ تِتر وکی بات چیت میں یہ طے پایا کہ تِتر وسبھی نوجوانوں کو لیکر مین روڈ پر آجائے گا جہاں ایک سِول ٹرک کھڑا ہوگا۔ وہ اُن لڑکوں کو ٹرک میں سوار کر کے آرمی بیرئر تک لائے گا اور جب وہ اپنے ساتھی سمیت ٹرک سے اُتر کر فوجی بیرئر کے پاس پہنچے گا۔ وہ ٹرک پر فائرنگ شروع کر دیں گے۔ اور سبھی ملی ٹینٹوں کو بھون ڈالیں گے۔ منصوبے کے مطابق تِتر و نے ویسا ہی کیا۔ اُس کے ساتھ فوج کا ایک اور مخبر تھا جو تِتر وگوجر پر نظر رکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ تِتر و نے 34 لڑکوں کو جن کی عمر 18 اور 25 سال کے درمیان تھی۔ ٹرک میں سوار کیا اور اُن کا اسلحہ لیکر ٹرک کے ٹول بکس میں رکھ دیا اور اُنھیں سمجھایا کہ آگے آرمی کا ناکہ لگا ہوا ہے۔ اُنہوں نے بیرئر لگا کر رُکاوٹ کھڑی کی ہے اور وہ ہر گاڑی کی تلاشی لیتے ہیں۔ تِتر و نے کہا کہ وہ آرمی جوانوں سے کہے گا کہ وہ ٹھیکیدار ہے اور لڑکے اُس کے مزدور ہیں اور وہ لوگ کام ختم کر کے منڈی اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ اُن لڑکوں نے تِتر وکی بات مان کر بندوقیں اور دیگر اسلحہ اُس کے حوالے کر دیا۔ پروگرام کے مطابق ٹرک جب فوجی ناکے کے پاس رُکا تو تِتر وٹرک سے نیچے اُترا اور فوجی جوانوں کے پاس گیا۔ جنہوں نے ٹرک کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ ملی ٹینٹوں کا کمانڈر سمجھ گیا کہ گائیڈ نے اُن کے ساتھ بے ایمانی کی ہے اور وہ آرمی کے نرغے

میں پھنس چکے ہیں۔ تترو کا دوسرا ساتھی بھی ٹرک سے جب اُترنے لگا تو کمانڈر نے اُسے پکڑ لیا، اور کہا جو ہمارے ساتھ ہوگا وہی اُس کے ساتھ بھی ہوگا۔ ایک آدھ منٹ تک جب دوسرا مخبر ٹرک سے نیچے نہیں اُترا تو فوجی جوانوں نے چاروں اطراف سے ٹرک پر فائر کھول دیا۔ ٹرک کی باڈی گولیوں سے چھلنی ہوگئی اور سبھی لڑکے مارے گئے۔ سڑک پر خون ہی خون تھا۔ لاشوں کو منڈی لایا گیا۔ اتنے میں وہاں بریگیڈ کمانڈر بھی آ گیا۔ بریگیڈئر اور کرنل نے دو جوانوں کو حکم دیا کہ وہ پٹرول چھڑک کر سبھی لاشوں کو جلا دیں۔ لیکن موقع پر موجود پولیس کے ڈی، ایس، پی شیخ غلام احمد نے بریگیڈئر کو سمجھایا کہ ایسا کرنے سے سول ایڈمنسٹریشن کے لئے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہوجائے گا۔ لہٰذا لاشوں کو دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔ بریگیڈئر مان گیا لیکن کہنے لگا کہ فوج اس کام میں کوئی مدد نہیں کرے گی۔ ڈی، ایس، پی شیخ غلام احمد نے رات کے بارہ بجے نیشنل کانفرنس کے مقامی بلاک صدر مرحوم غلام محمد گنائی المعروف ''ماما گنائی'' کو جگایا اور ساری بات بتائی۔ ماما گنائی نے مقامی لوگوں کو جگایا۔ دُکانیں کھلوائیں اور کفن کے لئے پکڑا لیا۔ موضع ''سیکلُو'' کے پاس ایک کھیت کے اندر تین قطاروں میں گیارہ، گیارہ قبریں کھُدوائیں اور 34 ویں قبر چوتھی قطار میں کھُدوائی۔ باقاعدہ نماز جنازہ پڑھی گئی اور صبح 5 بجے تک سبھی لاشیں دفنا دی گئیں۔ آج بھی اُن بچوں کی قبریں سیکلو میں موجود ہیں۔ یہ تمام باتیں خالد حسین کو ڈپٹی کمشنر نے خود بتائی تھیں۔ جس کا نام پی، جی دھر چکرورتی (آئی، اے ایس) تھا۔ ایس ایس پی پتمبر لال گپتا (آئی، پی، ایس) اور خالد حسین اسسٹنٹ کمشنر ڈیولپمنٹ پونچھ تھے۔

جن دِنوں خالد حسین ڈپٹی کمشنر پونچھ تھا، اُن ہی دِنوں وادیٔ کشمیر کے کچھ لڑکے پاکستانی انتظام والے کشمیر سے اسلحہ چلانے کی تربیت لے کر واپس آرہے تھے اور جمیا گلی کے جنگل میں تھکاوٹ دور کرنے کے لئے آرام کر رہے تھے کہ پولیس کے مخبر نے اُن کی آمد اور ستانے والی جگہ کی خبر ایس، ایس، پی شری پنکج سکسینہ کو دی۔ وہ پولیس کی نفری لے کر موقع پر پہنچ گئے اور اُن لڑکوں کو چاروں طرف سے گھیر کر سرنڈر کرنے کے لئے کہا۔ موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور پولیس کے سامنے سرنڈر کر دیا وہ سب لڑکے ضلع پلوامہ کے تھے اور اُن میں کوئی بھی غیر کشمیری نہیں تھا۔ شری پنکج سکسینہ نے اس واقعے کی اطلاع اپنے اعلیٰ افسران ڈی، آئی، جی پونچھ۔ راجوری رینج شری رام لبھایا او انسپکٹر جنرل پولیس جموں کو دی۔ ان دونوں نے پنکج جی کو حکم دیا کہ اُن سالوں کو گولیوں سے بھُون ڈالو۔ نوجوان پولیس افسر شش و پنج میں پڑ گیا کہ سرنڈر کرنے والے لڑکوں

کو وہ کیوں اور کس لئے مارے۔ وہ حق حلال کی روٹی کھانے والا ایک ایماندار آئی، پی، ایس افسر تھا اور صبح شام پوجا کرتا تھا۔ جب اُس پر سنیئر افسر دباؤ ڈالنے لگے تو اُس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ خالد حسین سے وائرلیس پر رابطہ قائم کیا اور صورتِ حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ نہتے لوگوں پر گولی چلانا قانونی اور اخلاقی جرم ہے۔ لہٰذا وہ اُس کی اُلجھن دُور کریں۔ خالد حسین نے اُسے سختی سے منع کیا کہ ہتھیار ڈالنے والے کسی بھی لڑکے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہئے کیونکہ وہ سب کشمیری ہیں، اس لئے اِس کا ردِعمل وادیٔ کشمیر میں بہت سخت ہوگا۔ خالد حسین نے وائرلیس کے ذریعہ پنکج سکسینہ جی کو پیغام بھیجا کہ وہ گرفتار کئے گئے سبھی ملی ٹینٹوں کو پونچھ تھانے میں لیکر آئیں کیونکہ پولیس کا کام ملزموں کو پکڑنا اور اُن کو عدالت میں پیش کرنا ہے نہ کو اُن کو مارنا۔ یوں اُن لڑکوں کی زندگی بچ گئی۔ اُس وقت پونچھ میں ملی ٹینسی زوروں پر تھی۔ فوج اور پولیس کے ساتھ ملی ٹینٹوں کے مقابلے آئے دِن ہوتے رہتے۔ دونوں طرف کا جانی نقصان ہوتا۔ ملی ٹینٹوں کا اسلحہ پکڑا جاتا۔ اُن کی کمین گاہیں مسمار کردی جاتیں۔ پندرہ، بیس دِنوں کے بعد ریاست جموں وکشمیر کے ڈائریکٹر جنرل پولیس سردار گوربچن جگت بذریعہ ہٹلی کا پٹر پونچھ دورے پر آئے۔ اُنہوں نے ڈپٹی کمشنر کو بھی ظہرانے پر بُلایا۔ انہوں نے پولیس کے اُن جوانوں میں انعام تقسیم کئے جو اُس مہم کا حِصہ تھے جس میں 18 لڑکوں نے ہتھیار ڈالے تھے۔ وہ خالد حسین کے گلے ملے اور مسّرت کا اظہار کیا کہ اُس کی بروقت مداخلت سے لا اینڈ آرڈر کی حالت خراب ہونے سے بچ گئی۔ اُنہی دِنوں ایک اور بڑا واقع بالاکوٹ کے گاؤں ترکُنڈی میں ہوا۔ یہ گاؤں لائن آف کنٹرول کے بالکل ملحق تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر راجپوت مسلمان رہتے تھے لیکن ایک رات پہلے بالاکوٹ میں تعینات فوجی بٹالین کے سپاہیوں نے گاؤں والوں کے ساتھ مار کٹائی کی تھی۔ فوجی جوانوں کی زیادتی کی وجہ سے گاؤں کی پوری آبادی سرحد کے پار چلی گئی تھی اور گاؤں بے چراغ ہو چکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار اور سرپنچ کی سربراہی میں گاؤں والوں نے سرحد پار کی تھی۔ اس واقع کی اطلاع جب ریاستی سرکار کو ملی تو چیف سیکریٹری شری اشوک جیٹلی اور ڈی، جی، پی ڈاکٹر گوربچن جگت نے خالد حسین اور پنکج سکسینہ کو حکم دیا کہ وہ دونوں ترکُنڈی کا دورہ کریں اور اُن وجوہات کا پتہ لگائیں جو گاؤں والوں کی ہجرت کا سبب بنیں۔ پنکج سکسینہ اور خالد حسین جب تُرکنڈی کے قریب آخری فوجی چوکی پر پہنچے تو اُنہوں نے بٹالین کے کرنل اور میجر سے ہجرت کرنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو دونوں فوجی افسر یہ ثابت کرنے میں لگے رہے کہ گاؤں والے اُگروادیوں کو اپنے گھروں میں پناہ دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے کچھ لوگوں کی تفتیش کی گئی۔ اُن لوگوں کے ورغلانے

پر ہی سارے گاؤں والے سرحد پار چلے گئے ہیں۔ جبکہ گاؤں کے پٹواری، گرام سیوک اور نائب تحصیلدار کا کہنا تھا کہ شام پانچ بجے سے لیکر صبح چھ بجے تک فوجی کسی دیہاتی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتے۔ فوج دِن رات ترکُنڈی میں گشت کرتی رہتی ہے۔ اس لئے فوجی افسروں کا الزام سفید جھوٹ ہے۔ جب پنکج سکسینہ اور خالد حسین گاؤں کی طرف جانے لگے تو فوج کے میجر نے اُنھیں جانے سے روک دیا اور کہا کہ سامنے والی پہاڑی پر پاکستانی فوج کی چوکی ہے اور وہ اُنھیں دیکھ کر گولیاں چلانی شروع کر دیں گے۔ جب ایس، ایس، پی سکسینہ اور خالد حسین نے میجر کی بات پر دھیان نہیں دیا اور ترکُنڈی کو جاتی پگڈنڈی اُترنے لگے تو اپنے ہی فوجیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ گولیاں اُن دونوں کے سروں کے اوپر سے گذر گئیں۔ اتنے میں وہی میجر آیا اور بڑے غُصّے اور بدتمیزی سے کہنے لگا۔ ''میں نے آپ دونوں کو روکا تھا لیکن آپ نہیں مانے۔ آپ کو جاتا دیکھ کر ہی پاکستانی فوجیوں نے گولیاں چلائی ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو کچھ ہو جاتا تو ہماری شامت آجانی تھی کہ ہم نے کیسے آپ کو ترکُنڈی جانے دیا۔'' اس پر پنکج سکسینہ جی نے بڑی سختی سے جواب دیا اور کہا:

''انڈین پولیس سروس میں آنے سے پہلے میں آرمی کا کمیشنڈ افسر تھا اور لیفٹیننٹ کے عہدے پر تعینات تھا۔ اس لئے مجھے بیوقوف مت بناؤ۔ میں ایل، ایم، جی اور اے کے 47 اور دوسرے ہتھیاروں سے چلنے والی گولیوں کی پہچان رکھتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ گولیاں سامنے والی پہاڑی سے نہیں بلکہ ہمارے پیچھے سے آئی ہیں اور پیچھے سے آنے والی گولیاں ہمارے اپنے جوانوں نے چلائی ہیں۔'' ایس، ایس، پی کی باتیں سُننے کے باوجود میجر ٹس سے مس نہیں ہوا اور بولا کہ اُسے حکم ہے کہ وہ اُنھیں گاؤں کی طرف نہ جانے دے۔ خالد حسین اور پنکج سکسینہ ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ میجر نے کچھ فوجیوں کو راستے میں کھڑا کر دیا تا کہ وہ گاؤں کی طرف نہ جا سکیں۔ اتنے میں ایک بوڑھا سر پر بستر اور برتن اُٹھائے اور ایک بُڑھیا دو بھینسیں اور ایک گائے کو ہانکتے ہوئے آرہے تھے۔ جب وہ بوڑھا، بوڑھی اُن دونوں کے پاس پہنچے تو خالد حسین نے اُن سے اصل واقع جاننا چاہا لیکن وہ ڈر کے مارے کچھ بول نہیں رہے تھے۔ جب خالد نے کہا کہ وہ یہاں کے ڈی سی ہیں اور یہ ایس، ایس، پی ہیں تو وہ رونے لگے۔ انہوں نے بتایا ''کل رات فوجیوں نے گاؤں والوں کی بڑی پٹائی کی۔ جوان عورتوں، لڑکیوں پر بھی ہاتھ اُٹھایا۔ جب مردوں نے مزاحمت کی تو اُن پر بندوقیں تان لیں اور بے رحمی سے پیٹا۔ گاؤں کے نمبردار اور سرپنچ نے گاؤں والوں کو لائن آف کنٹرول پار کرنے کے لئے کہا۔ بوڑھے شخص نے بتایا کہ پورا گاؤں راجپوت مسلمانوں کا تھا اور راجپوت بے غیرت نہیں

ہوتے۔اس لئے ہجرت کر گئے۔ ہماری بیٹی ترکنڈی میں بیاہی گئی ہے۔جب ہمیں صبح پتہ چلا تو ہم وہاں گئے۔ یہ مال مویشی اور سامان ہمارے داماد کا ہے اور ہم یہ مویشی اپنے گھر لے جا رہے ہیں تا کہ فاقہ کشی سے نہ مریں۔'' رات کو خالد حسین اور پنچ صاحب راجوری چلے گئے اور وہاں ڈی ،آئی ،جی رام لبھایا کو ساری رپورٹ دی۔اُسی وقت پاکستان کے سرکاری ٹیلی ویژن سے خبریں پیش کی جا رہی تھیں کہ سکرین پر ترکُنڈی کے نمبردار کے انٹرویو کا وہ حصہ دِکھایا گیا۔جس میں وہ اپنا جسم دِکھا رہا تھا جو زخمی تھا۔نمبردار وہی باتیں بتا رہا تھا جو دِن کو اُس بوڑھے شخص نے کہی تھیں۔ پونچھ پہنچتے ہی دونوں نے ایک مشترکہ پورٹ تیار کی اور چیف سیکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل پولیس کو بھیج دی۔اُس کی ایک کاپی ڈویژنل کمشنر جموں شری انل گوسوامی (جو بعد ازاں بھارت سرکار کے امور داخلہ کے سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) کو بھی بھیج دی۔گوسوامی صاحب نے ایک چٹھی کور کمانڈر،16۔کور کو لکھی اور رپورٹ کی کاپی نتھی کر دی۔کور کمانڈر صاحب نے اپنے جواب میں لکھا کہ دونوں افسر اُگر وادیوں کی بولی بول رہے ہیں۔اُن کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔اُس رپورٹ کی نقل خالد حسین نے مجھے پڑھائی تھی۔ چند دِنوں کے بعد چیف سیکرٹری اشوک چیٹلی صاحب نے خالد حسین کو اپنے دفتر میں بُلایا اور ساری بات زبانی بھی سُنی۔اُنہوں نے رپورٹ کے ساتھ نتھی تحصیلدار اور پولیس کے مقامی ایس ،ایچ او اور بلاک افسر کے لکھتی بیان بھی پڑھے اور کہا کہ وہ بے خوف ہو کر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے اور کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں جبکہ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے چیٹلی صاحب سے کہا تھا کہ وہ خالد کو وہاں سے تبدیل کر دے۔کہیں فوجی اُس کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔لیکن چیف سیکریٹری ڈاکٹر صاحب کی رائے سے متفق نہیں تھے۔

بطور ڈپٹی کمشنر پونچھ خالد حسین کو کئی مزید آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔جیسے مینڈھر تحصیل کے گاؤں ہرنی کا واقع، جہاں چار معصوم ہندوؤں کا دہشت گردوں کے ہاتھوں قتل ہونا، اور کشمیر کی تحصیل ترال کے گاؤں چھٹی سنگھ پورہ میں 36 بے گناہ سکھوں کا قتل۔'ہرنی' گاؤں میں بے گناہ ہندوؤں کے قتل کی وجہ دراصل ہمارے کچھ سرپھرے فوجیوں کے احمقانہ کارنامے کا ردِعمل تھا۔ ہمارے چند فوجی شراب کے نشے میں آدھی رات کو سرحد پار کر کے ایک شادی والے گھر کی چھت پر سوئے ہوئے سات آدمیوں کے سر کاٹ کر سرحد کی اپنی طرف لے آئے تھے۔اُن کے دھڑ پاکستان ٹیلی ویژن اپنی خبروں میں دکھا رہا تھا اور نوجوان نعرے لگا رہے تھے کہ ایک کا بدلہ سو سے لیں گے۔خالد حسین نے ٹیلی ویژن پر دِکھائے جانے والے مناظر خود دیکھے اور ایس ،ایس ،پی سکسینہ کو فون پر ساری بات سنائی اور کہا کہ

وہ ضلع کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو حکم جاری کرے کہ جہاں جہاں ہندو اقلیت رہتی ہے۔ اُن کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے اور اُن کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ ہرنی گاؤں کے پولیس اسٹیشن کے انچارج نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا، اور کوئی حفاظتی قدم نہیں اُٹھایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دِن کے اُجالے میں تقریباً 11 بجے دہشت گردوں نے گاؤں پر دعویٰ بول دیا اور چار بے قصور لوگوں کو قتل کر دیا۔ ہندو برادری نے اِس واقع کے خلاف زوردار مظاہرہ کیا۔ خالد حسین اور پنکج سکسینہ پونچھ سے ہرنی گاؤں پہنچے اور لوگوں کو شانت کرنے لگے لیکن تب تک وہاں سیاسی روٹیاں سیکنے والے لوگ راجوری، پونچھ اور سورن کوٹ سے آ گئے تھے۔ وہ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے اور تشدد پر اُتر آئے تھے۔ خالد حسین اور پنکج سکسینہ اُنہیں پُر امن رہنے کی تاکید کرتے رہے اور سمجھانے لگے کہ ارتھیوں کا کریا کرم شام ہونے سے پہلے پہلے کرنا ضروری ہے کیونکہ اِس علاقے میں ملی ٹینٹوں کی کمین گاہیں پہاڑیوں میں ہیں اور وہ صورتِ حال کا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، لیکن احتجاج کرنے والے پاکستان کے خلاف اپنے پردھان منتری شری اٹل بہاری واجپائی اور وزیراعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ کے خلاف لگاتار نعرے بازی کرتے رہے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ وزیراعظم جب تک یہاں خود نہیں آئیں گے وہ لاشوں کا انتم سنسکار نہیں ہونے دیں گے۔ اُسی وقت ہیلی کاپٹر کے ذریعے انسپکٹر جنرل پولیس پرمجیت سنگھ گِل (جو بعد ازاں پنجاب پولیس کے ڈائریکٹر جنرل بنے) وہاں پہنچے۔ گِل صاحب اور خالد حسین نے لوگوں سے کہا کہ امن بنائے رکھیں اور کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائیں، جس کی وجہ سے دہشت گردوں کو نئی واردات کرنے کا موقع ملے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ سرکار کے نمائندے ہیں اور عوام کے جذبات پرائم منسٹر اور چیف منسٹر صاحبان تک پہنچا دیں گے۔ فی الحال شام ہو رہی ہے لہٰذا شہیدوں کا انتم سنسکار ہونے دیں۔ باقی لوگوں کی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ راجوری، نوشہرہ اور پونچھ سے آئے لوگ آہستہ آہستہ جانے لگے۔ شام ہونے تک صرف مقامی لوگ رہ گئے۔ پولیس کے سپاہیوں نے لکڑی کا بندوبست کر لیا تھا اور چتائیں بنالی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں اور پولیس و انتظامیہ کے اہلکاروں نے لاشوں کا انتم سنسکار کر دیا۔ یہ واقع 4-3/اپریل 2000 کا ہے۔

اسی مہینے یعنی اپریل میں ترال کے موضع چھٹی سنگھ پورہ میں 36 بے گناہ سکھوں کو بندوق دھاریوں نے شہید کر دیا تھا۔ ایک ہاہا کار مچ گیا۔ پوری ریاست اور بیرون ریاست بڑے بڑے جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ سرکار نے سبھی ڈپٹی کمشنروں کو وائرلیس کے ذریعے اس واردات کی اطلاع دے دی تھی تاکہ وہ اپنے اپنے ضلع میں امن قائم رکھنے کے لئے ہر ضروری قدم اُٹھائیں۔ اُس واردات سے

ایک روز پہلے خالد حسین دو دِن کی چھٹی لیکر اپنے ننھیال ڈوڈو (تحصیل لاٹی) تعزیت کے لئے گیا تھا۔ جہاں اُس کے برادرِ نسبتی (اہلیہ کے پھوپھی زاد) منظور کو دہشت گردوں نے مار دیا تھا۔ ابھی وہ وہاں پہنچا ہی تھا کہ بارڈر سکیورٹی فورس کا ایک ڈی، ایس، پی سرکاری گاڑی لیکر پہنچ گیا اُس نے کہا کہ ڈویژنل کمشنر صاحب کا حکم ہے کہ وہ فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچیں۔ اسی لئے وہ سرکاری گاڑی لیکر آیا ہے۔ فاتحہ خوانی کے بعد خالد وہاں سے اُدھم پور پہنچا۔ جہاں ڈپٹی کمشنر ادھم پور محمد سعید خان نے کار تیار رکھی تھی۔ چائے کا کپ پینے کے بعد خالد حسین ریاسی، پونی اور کالاکوٹ کے راستے راجوری پہنچا۔ جہاں ڈپٹی کمشنر بشیر احمد رونیال کھانے پر اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد خالد حسین رونیال صاحب کی کار میں بھمبر گلی پہنچا جہاں اُس کی سرکاری کار اور سیکورٹی کا عملہ اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ خالد حسین مینڈھر کے راستے تقریباً رات دو بجے پونچھ پہنچ گیا۔ اُسی وقت ایڈشنل ڈپٹی کمشنر قلندر یہ صاحب، اے، سی ریونیو اور تحصیلدار پہنچ گئے اور اُنہوں نے بتایا کہ کل پونچھ میں ایک بہت بڑا جلوس نکالا جا رہا ہے۔ جس میں سکھوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی شامل ہوں گے۔ اُسی وقت ایس، ایس، پی پنچ سکسینہ بھی آ گئے اور باہم مشورے سے حکمتِ عملی بنانے لگے کہ کل کے جلوس کے دوران امن وامان کو کس طرح برقرار رکھنا ہے۔ خالد حسین کا خیال تھا کہ وہ بھی جلوس میں شامل ہوں گے۔ اس سے لوگوں میں اچھا پیغام جائے گا کہ ضلع کی انتظامیہ بھی اس دُکھ کی گھڑی میں عوام کے ساتھ ہے۔ صبح 10 بجے کے قریب کرشن چندر پارک سے ایک بڑا جلوس نِکلا۔ خالد حسین اور قلندر یہ صاحب جلوس میں شامل تھے۔ پونچھ قلعہ کے پاس خالد حسین نے ایک دُھواں دھار تقریر کی اور کہا کہ دہشت گردوں اور قاتلوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مرکزی اور ریاستی سرکار نے چھٹی سنگھ پورہ کی ظالمانہ کاروائی کی سخت ترین الفاظ میں مذّمت کی ہے۔ اُنہوں نے سکھ بھائیوں سے کہا کہ وہ شہیدوں کی آتما کی شانتی کے لئے گورودوارہ صاحب میں اکھنڈ پاٹھ رکھیں اور واہیگورو سچے پادشاہ سے ارداس کریں کہ وہ شہیدوں کی قربانی کو قبول کرتے ہوئے پورے دیش میں امن اور شانتی بنائے رکھے تاکہ صدیوں کا آپسی بھائی چارہ قائم رہے۔ لوگ شانت ہوکر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بھوگ والے دِن خالد حسین نے گورودوارے میں آکر ماتھا ٹیکا اور سنگت کے سامنے اپنے خیالات رکھے اور لنگر کی سیوا بھی کی اس طرح پونچھ میں حالات کو بے قابُو نہیں ہونے دیا۔

دہشت گردی کی اُس کاروائی کا الزام بھارت سرکار نے پاکستان پر لگایا تھا اور کہا تھا کہ دہشت گرد آئی، ایس، آئی اور لشکر طیبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ چند روز کے بعد فوج اور سیکورٹی فورس نے دعویٰ کیا کہ

چھٹی سنگھ پورہ میں واردات کرنے والے پانچ دہشت گرد ہلاک کر دیئے گئے ہیں۔جبکہ مقامی لوگوں نے اُن کو مقامی باشندے قرار دیا اور کہا کہ اُن کو گھروں اور دُوکانوں سے اُٹھا کر سیکورٹی فورس والے لے گئے تھے۔اس پر پورے کشمیر میں مظاہرے شروع ہو گئے ۔ ہڑتالیں اور جلوس نکالے گئے ۔عدالتی حکم سے قبر کشائی کی گئی اور نام نہاد دہشت گردوں کی لاشوں کو باہر نکالا گیا۔اُن کا ڈی ،این اے ٹیسٹ کیا گیا اور ثابت ہوگیا کہ پانچ معصوم نوجوانوں کو بلّی کا بکرا بنا کر قتل کر دیا گیا تھا۔گورنمنٹ نے ایک انکوائری کمیشن بنایا جس کی رپورٹ کبھی نہیں آئی۔ترال کی مقامی سکھ برادری اور حریت والے اُس واردات کو دہشت گردی کی کاروائی نہیں مانتے تھے۔اُن کا کہنا تھا کہ یہ کام اکھوانیوں (وہ بندوق بردار جو فوج نے پال رکھے ہیں اور جو فوج اور سکیورٹی فورسز کے کہنے پر وارداتیں انجام دیتے ہیں اور مخبری کا کام بھی کرتے ہیں) کا ہے،لیکن لوگوں کی پُرزور مانگ کے باوجود سرکار نے کوئی انکوائری نہیں کرائی۔چھٹی سنگھ پورے کی واردات امریکی صدر مسٹر کلنٹن کے دورہ کے وقت ہوئی تھی اور جب صحافیوں نے امریکی صدر سے اُس واردات کے بارے میں اُن کی رائے پوچھی تو اُنہوں نے کہا تھا کہ اس واردات کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے۔البتہ جو معصوم لوگ مرے ہیں وہ اُن کی وجہ سے ہی مرے ہیں۔یہ بات کہہ کر امریکی صدر نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

پونچھ ضلع کے پہاڑی علاقوں میں سرکاری سکولوں کے ٹیچر اکثر اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتے۔وہ اپنی جگہ بے روزگار پڑھے لکھے نوجوانوں کو تین چار ہزار ماہوار پر دور دراز علاقوں کے سکولوں میں پڑھانے کے لئے رکھ لیتے اور مستقل اسکول ماسٹر گھر بیٹھے کوئی کاروبار کرتے یا لیڈری کرتے ۔ بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوان حاصل ہونے والی رقم کو اپنا جیب خرچ سمجھ کر سکول کھولتے ، بند کرتے اور بچوں کو پڑھاتے ۔خالد حسین نے ضلع کے سکولوں کی حالت سدھارنے اور سرکاری اُستادوں پر نکیل کسنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہوسکا۔پونچھ پوسٹینگ کے دروان خالد حسین کو چند ذہین نوجوانوں کا ساتھ ملا جو علم وادب سے شغف رکھتے تھے۔اُن کے لئے خالد حسین کی سرکاری کوٹھی کے دروازے کھلے رہتے ۔اُن میں ڈاکٹر لیاقت جعفری، سوامی انتر نیرو اور انور خان ایسے نوجوان تھے جو بہت اچھے شاعر تھے۔اُن کے تعاون سے خالد حسین نے پونچھ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد مشاعرہ کروایا۔لیاقت جعفری کی مشاورت سے اردو کے نامور شاعر جناب بشیر بدر کو پونچھ لایا گیا۔اور ''ایک شام بشیر بدر کے نام'' کے عنوان سے مشاعرہ ہوا۔جس میں صرف بشیر بدر شاعر تھے اور ڈیڑھ ہزار ادب نواز سننے والے۔راجوری کے ڈپٹی کمشنر اور ایس،ایس، پی خصوصی طور پر بشیر

بدر کو سننے کے لئے آئے تھے۔ پروگرام کی ساری کاروائی ڈاکٹر لیاقت جعفری نے انجام دی۔اُس نے بڑی خوبصورتی سے پروگرام کنڈیٹ کیا حالانکہ نظامت کرنے کا یہ اُس کا پہلا تجربہ تھا۔ اسی دروان سرکار نے پنچایت الیکشن کروانے کا فیصلہ کیا۔ پنچایت الیکشن خالد حسین کے لئے ایک بڑا چیلنج تھا لیکن سوامی انتر نیرو، خالد میر، انور خان اور لیاقت جعفری نے اُس کی بڑی مدد کی۔ الیکشن کا دفتر خالد حسین نے اپنی سرکاری کوٹھی کے برآمدے میں لگایا۔اُس کی ہدایت کے مطابق یہ نوجوان کام کرنے لگے۔سارا کاغذی کام انہی نوجوانوں نے کیا۔ پنچایت الیکشن کامیابی سے انجام کو پہنچا۔کوئی ناخوشگوار واقع نہیں ہوا اور اللہ تعالیٰ نے خالد حسین کی عزت رکھ لی۔ دوسرے سال لیاقت جعفری کے مشورے سے ندا فاضلی اور سردار پنچھی کو پونچھ بُلایا گیا۔خالد حسین کا دوست سردار پرتپال سنگھ بیتابؔ بھی مدعو تھا۔ وہ مشاعرہ بھی بڑا کامیاب رہا۔ واپسی کے سفر میں سردار پنچھی ہر آدھے پونے گھنٹے کے بعد پیشاب کرنے کیلئے کار رُکواتا۔جب کار کالی دھار کی چڑھائی چڑھ رہی تھی تو خالد حسین نے ندا فاضلی سے پوچھا ''حضور! چائے نوش فرمائیں گے'' تو اُنہوں نے کہا ''ضرور''۔ وہاں ایک ڈھابے پر بہت عمدہ چائے بنتی تھی۔ کار وہاں روکی گئی۔ چائے کا آرڈر دیا گیا۔ندا فاضلی ، بیتابؔ اور خالد اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔اتنے میں سردار پنچھی نے خالد حسین سے پوچھا ''یار خالد! جموں اب کتنی دُور رہ گیا ہے؟

تو خالد حسین کے مونہہ سے بے ساختہ نکلا ''بس دو پیشاب''۔سب ہنس پڑے۔ندا فاضلی کے تو ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔ وہ جہاں بھی مشاعرہ پڑھنے جاتے تو اکثر سردار پنچھی والا لطیفہ سُنایا کرتے۔''ایک شام بشیر بدر کے نام'' والا تجربہ دُہراتے ہوئے خالد حسین نے اپنے دوست اور مشہور پنجابی شاعر سرُ جیت پاتر کو جموں آنے کی دعوت دی۔سرُ جیت پاتر کی دی ہوئی تاریخ کے مطابق کلچرا کادمی کے ''ابھینو تھیٹر'' میں 'اِک شام پاتر دے ناں' کے عنوان سے پروگرام مرتب کیا گیا۔کارڈ چھپوائے گئے۔کارڈ بانٹے گئے۔شام پانچ بجے کا پروگرامتھا۔صبح چھ بجے سرجیت پاتر سے خالد حسین نے بات کی۔اُس نے کہا کہ وہ بے فکر رہے۔ وہ وریام سندھو (مشہور کہانی کار) کو ساتھ لیکر وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ جائے گا۔سرُ جیت پاتر کے نام پر سارا ہال بھر گیا۔سرُ جیت پاتر سے خالد نے پھر رابطہ کیا تو وہ کہنے لگا کہ وہ مادھو پور میں چائے پی رہے ہیں اور بس نکلنے والے ہیں۔ خالد حسین نے کہا کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہے۔اُن کا بے تابی سے انتظار ہو رہا ہے۔فوراً پہنچو۔ پانچ بج گئے۔ چھ بج گئے۔لیکن پاتر کا کوئی اتا پتہ نہیں تھا۔خالد فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتا تو فون بند۔خالد حسین نے

پروگرام شروع کر دیا اور نہایت مودبانہ انداز میں سامعین وحاضرین سے کہنے لگا کہ سُرجیت پاتر صاحب تھوڑی دیر میں تشریف لا رہے ہیں دراصل اُن کی کار خراب ہوگئی تھی۔اُس کو ٹھیک کرانے میں وقت لگ گیا لیکن سامعین فکر نہ کریں، وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔جب تک پاتر صاحب تشریف لاتے ہیں وہ آپ کو چند لطیفے سُناتے ہیں تا کہ آپ کی بوریت ختم ہو۔خالد حسین نے لطیفے سنانے شروع کئے۔سات بجنے کو تھے۔لطیفوں کا سٹاک ختم ہو رہا تھا کہ اتنے میں سٹیج پر سُرجیت پاتر اور وریام سندھو نشے میں جھُومتے تشریف لائے۔خالد حسین نے شُکر کا کلمہ پڑا۔انتظار کرتے کرتے آدھا ہال خالی ہو چکا تھا لیکن جب وریام سندھو نے نظامت شروع اور سرُ جیت پاتر نے اپنا کلام سنانا شروع کیا تو سامعین پاتر کی شاعری کے نشے میں جھومنے لگے۔واہ واہی ہونے لگی۔کوک کی بوتل میں وہسکی کے گھونٹ پاتر اور وریام وقفے وقفے سے پیتے رہے۔پاتر ترنم میں اپنی غزلیں سناتا رہا اور لوگ فرمائش کرتے رہے کہ فلاں غزل سنائی جائے۔رات کے دس بجے تک دونوں شیر کے بچوں نے سامعین کو باندھ کر رکھا۔ہوٹل کے کمرے میں جب خالد حسین باز پرس کرنے لگا تو کہنے لگے۔''یار! مادھو پور بڑی خوبصورت جگہ ہے۔نہر کے کنارے بیٹھ کر راوی دریا کا دُکھ بانٹنے کے لئے ہم نے وہسکی پینی شروع کی۔ہم نے راوی کے پانی کا مکھ موڑ کر اچھا نہیں کیا۔لاہور بیچارہ پیاسا مر جائے گا۔اُس کے کھیت سوکھ جائیں گے۔یہ سیاست دان پاگل کیوں ہوتے ہیں کہ قدرت کے نظام کو لگام لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔سالے،خرام خور،بس،راوی کا درد ہم سے سہا نہیں گیا اور ہم نے وہسکی کی پوری بوتل پی ڈالی۔تم بتاؤ یار خالد! ہم نے اچھا کیا نا۔اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔پھر ہم نے کوکا کولا کی بوتل منگوائی۔آدھا کوک پھینک دیا اور پھر اُس میں وہسکی ڈال کر بوتل پھر بھر لی اور وہاں سے چل پڑے۔لیکن تُو تو خوش ہو جا۔تیرا پروگرام تو کامیاب ہو گیا۔ہم نے تو تمہارے جھنڈے گاڑھ دیئے ہیں۔تُو جا اب گھر۔ہماری بھابھی تیرا انتظار کرتی ہوگی۔'' ایسے تھے خالد حسین کے ادبی اور غیر ادبی دوست۔میرا نام محمد بشیر بٹ ہے۔جب خالد حسین راجوری میں اے،سی،ڈی تھا تو میں وہاں تحصیلدار تھا اور جب وہ پونچھ میں ڈپٹی کمشنر بن کر آیا تو میں وہاں اسسٹنٹ کمشنر ریونیو تھا۔ہم دونوں بے تکلف دوست تھے حالانکہ ڈی،سی ہونے کے ناطے وہ میرا باس تھا لیکن اُس نے کبھی باس ہونے کا احساس نہیں کرایا۔بلکہ وہ اپنے غم اور خوشیاں مجھ سے بانٹتا رہتا تھا۔خدا مغفرت کرے۔

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں (بشیر بدرؔ) ☆☆☆

Yaqoob Tasawwur (Los angeles USA) cell-001-636-2930-421
یعقوب تصور (لاس انجلس، امریکہ)

نعت Naat

یہ عروج دیکھا ہے حسیت کا حسیں نبی کے دیار میں
کہ رہے فرشتے رواں دواں مرے ساتھ قرب و جوار میں
تھی مری جبین حق آشنا تو در رسول کی خاک پر
مری روح رقصاں تھی باغ خلد کی نکہتوں کے حصار میں
یہ انہیں کے باب کی بھیک ہے یہ انہیں کے نام کی ہے عطا
جو تجلیاں ہیں نصیب میں جو بلندیاں ہیں وقار میں
مرے جسم کو لئے وسط میں رہے حالہ نور کا رقص گوں
میں اٹا ہوں جب سے دیار رحمت عالمیں کے غبار میں
یہ ہیں سب خدا کی عنایتیں ہیں رسول حق کی سخاوتیں
میں تمام عمر رہا ہوں وسط خزاں بھی دور بہار میں
میں سمیٹ لایا ہوں اپنے دامن دل میں شہر رسول سے
ہے جو ضو فشانی شعور میں ہے جو نور حسن شعار میں
یہ سخن میں عزت و شان بھی مجھے نعت گوئی سے ہے ملی
میں کہاں تھا نقد و نظر کی ورنہ نگاہ ناز شمار میں
جہاں جاؤں عزت و احترام کی ہی نگاہ نصیب ہو
یہ تصور آپ پہ رحمتیں ہیں نبی کی ذات سے پیار میں

☆☆☆

Parvin Shere (New Jersey,USA) cell-001-650-656-5271
پروین شیر (نیوجرسی، امریکہ)

نظمیں Nazmein

غار در غار Cave Within Cave

وقت کے بے کراں غار میں
ہیں ازل سے بھٹکتے بدن
ہے بھرم
بس یہی ہے مکمل کہ اب
کچھ نہیں ہے، کہیں کچھ نہیں
ہے پس غار کیا
کچھ خبر ہی نہیں
یہ اندھیروں کی خوگر نگاہیں جہاں
صرف پرچھائیاں ہی حقیقت ہیں بس

جسم کے غار میں
جاں بھٹکتی ہے تاریکیوں میں لئے
تیسری اک نظر کا دیا
جس کی پلکیں ابھی تک کھلیں بھی نہیں۔۔۔!

☆☆☆

(2)

فیصلہ The Decision

آج پھر۔۔۔
مجھ سے ملنے مرے/ دو عزیز آ گئے
اپنی روداد مجھ کو سنانے لگے
رنجشیں، الجھنیں، تلخیاں، کشمکش
سب بتانے لگے
دونوں بدحال تھے
بال بکھرے ہوئے/ آنکھیں دہکی ہوئی
ہونٹھ سوکھے ہوئے
اپنی اپنی ضدوں پہ اڑے
اپنی منطق سے ثابت یہ کرنے لگے
کون ملزم ہے اور کون مظلوم ہے
آج پھر فیصلہ میرے ہاتھوں میں تھا
ہتھکڑی کس کو پہناؤں میں
سن کے دونوں کی روداد میں
سوچتی رہ گئی
جرم کس نے کیا؟
کون کس کا خطا کار ہے؟
آخرش فیصلہ میں نے کر ہی دیا
اور اب۔۔۔
پابہ زنجیر، تاریک زنداں میں بیٹھا ہے دل
ذہن روشن فضاؤں میں آزاد ہے

☆☆☆

(3)

زرد رو (جاتے ہوئے برس کے نام)
Pale-Faced (For the passing year)

ایک مدت سے یونہی کھڑا ہے پرانا شجر
اس کی ٹہنی کو تھامے ہوئے
آج پھر
زرد رو ایک پتہ لرزتا ہوا
ٹوٹ کر گر رہا ہے گئی رت کی خاشاک پر!
اس کے بوڑھے خمیدہ بدن پر ہیں
سوکھی رگوں کی جو پگ ڈنڈیاں
لے کے جاتی ہیں ماضی کی دہلیز پر
اس کی لرزش کی آہٹ میں ہیں
ان گنت داستاں کے افق
جن پہ ہے آنسوؤں اور خوشی کی دھنک
سلسلہ ہے یہی
اس شجر کی لچکتی ہوئی شاخ سے
ٹوٹ کر پھر سے گر جائے گا
خشک پتوں کے انبار پر
دوسرا زرد رو برگ
پھر سے کہے گا وہی داستاں!!

☆☆☆

Aslam Imadi (Hyderabad)
اسلم عمادی (حیدرآباد) cell-9966683014

آخری منظوم کے بعد

سنگ دل دلاں زہر ہوا پی کے چلے
چشم گل تازہ لئے
ریگ پر رکھی ہوئی فلسفہ آوازوں کو ان
سونگھتے حرفوں کا تماشہ
دیکھوں۔؟

چونکتی آنکھوں کو اعصاب کی لرزش کا سبب
قوس وتحریر سے ہنگامہ دری کا کوئی معیار
مقرر کر کے
مسکراہٹ کے نئے ناپ بنانے کے لئے
کس طرح لوگوں نے
ہنگامہ کیا۔؟

میں نے معصوم سے بچے کی طرح
چپکے سے پتھر کو اٹھایا، سامنے موٹر کے
چمکتے ہوئے شیشے کو ذرا چوم کے
آجانے کو بھیجا تو کہا سب نے
کہ یہ ایک بہت غیر حقیقی سا عمل ہے تو
بھلا کون کہے۔۔؟ ☆☆☆

بلاوا

آؤ کالے سانپ
میں کب سے تمہارا منتظر ہوں
تم مری کھڑکی کے شیشے سے گزر کر
چپکے چپکے آرہے ہو
تم غلط فہمی کے پانی میں رواں ہو
سوچتے ہو۔۔تم مجھے پی جاؤ گے
میں تمہاری ہر زہ کاری، جعل سازی کو
چمکتا دیکھتا ہوں
پھر بھی میں انسان ہوں
میں نے دیکھے ہیں ہزاروں
بھوکے پیاسے اژدہے

آؤ کالے سانپ
میرے سر پہ بیٹھو۔۔دل کو چاٹو
آؤ اپنی دم ہلاؤ
ہاں مگر اک روز مین
لہر کھاتی دم پکڑ کر جھٹکا دوں گا۔۔تم مر جاؤ گے
اور پھر جب تم کبھی یاد آؤ گے
میں تمہاری لاش پر
دودھ کا تحفہ رکھوں گا اور تم۔۔!!
☆☆☆

Dr. Sarwat Zahra(USA)
cell-001-804-833-5141
ڈاکٹر ثروت زہرہ (امریکہ)

نظم Nazm

گلگمیش اب بھی سفر میں ہے
خدا نے ابھی آسماں کے کناروں سے
قوس قزح کے زمانوں کو باندھا
مجھے آرزو کی زبانوں میں لوری سنائی
مگر نیند آنی نہیں تھی
نہ آئی ! نہ آئی
دہائی ! دہائی

زمیں نے مری کوکھ میں صندلی خواب کی
ایک گدی بچھائی
وجود زیاں سے کسی کن فکاں تک
جہانوں کی دنیا تھمائی
مگر نیند آنی نہیں تھی
نہ آئی! نہ آئی
دہائی! دہائی

ازل نے ہتھیلی پہ اپنے ابد تک کی
سرسبز مہندی رچائی
تمنا کی سرخی کے اجلے لہو میں
جبیں
پور سے پور تک "بو" نہائی
مگر نیند آنی نہیں تھی، نہ آئی
نہ آئی ! نہ آئی
دہائی ! دہائی

سنبھلتے ہوئے سات پرتوں تلک
آسمانوں نے دنیا دکھائی
مرے خواب نے کھیل کو
پھر سے مہروں کی
علت سجائی
مگر نیند آنی نہیں تھی
نہ آئی ! انہ آئی
دہائی ! دہائی

مئے غم نے مٹی کی پودوں میں خواہش کی
کونپل سجائی
لگا سبزہ ءراز کے بوجھ سے کل زمیں ڈگمگائی
مگر نیند آنی نہیں تھی
نہ آئی! نہ آئی
دہائی! دہائی

☆☆☆

Khalid Jamal (Varanasi
خالد جمال (وارانسی) cell-9838202248

بے زمینی Bezamini

خط امتیاز سر کرتی ہوئی فوجیں
آگ اگلتی گنیں
انسانیت کو پامال کرتے ہوئے
لہولہان بدن کے چیتھڑے
روتے بلکتے ہوئے بچے
اپنی زمین کھوتے ہوئے لوگ
ہمارے چہروں پر
بے زمینی کی خاک ڈالتے ہوئے
بے نام وادیوں کی طرف بڑھ جاتے ہیں

خراج Kheraj

لہو کے ساز پر رقصاں ابابیلیں
قفس کو توڑ ڈالیں گی
مری موہوم خواہش کو
جلا دیں گی/ بلائیں گی
بدن کے شوخ نخلستان کی جانب
میں دنیا کے تقاضوں سے/ چھڑا کر جاں
ترے ہی پاس آؤں گا
ترے ہونٹوں کو چوموں گا
خراج جسم و جاں دوں گا ☆☆☆

الجھن Uljhan

بے سبب کیوں رات دن الجھا ہوں میں
کیسی الجھن ہے یہ آخر
کچھ پتہ چلتا نہیں
ایک دکھ میں مبتلا ہوں رات دن
دکھ بھی کیا ہے کچھ پتہ چلتا نہیں
بے صدا آواز تو سنتا ہوں میں
یہ صدا کس کی ہے آخر/ کچھ پتہ چلتا نہیں
رات دن کا کھیل جاری ہے مگر
میرا کیا کردار ہے اس کھیل میں
میں پریشاں/ کچھ پتہ چلتا نہیں
لوگ حیراں ہیں مجھے یوں دیکھ کر
اور حیراں کیوں/ پتہ چلتا نہیں
ایک دوجے میں الجھتے راستے
راستوں میں اپنے رستے کی تلاش
ختم ہوتی ہی نہیں
میں کیا کروں
منزلوں کا/ کچھ پتہ چلتا نہیں
سوچتا ہوں
خاک پیراہن کو میں
راستے میں چھوڑ دوں/ آگے بڑھوں
بے سبب کیوں رات دن الجھا ہوں میں
☆☆☆

Qaumi talimi policy 2020 aur movasilati Maharat by Dr. Syed Tauquir Imam (Asst.Prof. MANUU CTI Asansol) cell-8637088250
ڈاکٹر سیّد توقیر امام (اسسٹنٹ پروفیسر، MANUU کالج آف ٹیچر ایجوکیشن، آسنسول)

قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور مواصلاتی مہارت

خلاصہ:
موجودہ منظرنامے میں کسی بھی قوم کا ترقیاتی مقصد عالمی چیلنجوں کے مطابق اپنی پالیسی کو از سر نو تشکیل دینا ہے۔ موجودہ پالیسی نے تعلیمی نظام کو از سر نو ترتیب دینے کا منصوبہ بنایا ہے تاکہ 2030 کے پائیدار ترقیاتی اہداف (SDG) کو حاصل کیا جا سکے، جو سب کے لیے معیاری اور مساوی تعلیم کو یقینی بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پالیسی کا مقصد ملک کی تعلیم کو عالمی چیلنجوں کے لیے تیار کرنا اور ملک کی آبادی کو عالمی معیار کے مطابق تیار کرنا ہے۔ اس تناظر میں، قومی تعلیمی پالیسی 2020 اکیسویں صدی کی ان مہارتوں کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور ان کی ترقی کے لیے ایک جامع فریم ورک پیش کرتا ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 زبان اور مضبوط مواصلاتی مہارتوں کی ترقی کی اہمیت پر زور دیتا ہے، جس میں تحریری اور زبانی مواصلات کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل خواندگی بھی شامل ہے۔ اس سے طلباء کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے اور تیزی سے بڑھتی ہوئی ڈیجیٹل دنیا میں دوسروں کے ساتھ مؤثر طریقے سے تعاون کرنے کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام کا چیلنج زبان کی تعلیم ہے۔ زبان علمی اور غیر علمی کارکردگیوں کے ساتھ ساتھ انسانی سرگرمیوں کے ہر دائرے میں بہت سے مقاصد کی تکمیل کرتی ہے۔ یہ خیالات، احساسات، معلومات اور علم کے ابلاغ میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ تعلیمی اور پیشہ ورانہ اہداف کے حصول کے لیے زبان کی مہارتیں ایک شرط ہیں اور یہ زبان کی مہارتیں مؤثر مواصلات کو بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس موجودہ مقالے میں، قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے تحت زبان اور مواصلاتی مہارتوں کی اہمیت پر توجہ دی گئی ہے۔

کلیدی الفاظ: قومی تعلیمی پالیسی 2020، مواصلاتی مہارتیں، سننا، بولنا، پڑھنا، لکھنا

قومی تعلیمی پالیسی 2020

تعارف:

نئی تعلیمی پالیسی میں شامل زبان سے متعلق پہلوؤں کا اساتذہ اور اساتذہ کے تربیت دینے والوں پر زبردست اثر ہوتا ہے زبان کو فروغ دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی وراثت میں ملی ہوئی مہارتوں کو محفوظ رکھیں اور یہ یقینی بنائیں کہ ہم انہیں مستقبل کی نسلوں تک پہنچائیں۔ ہم جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنی زبان، فن اور ثقافت کو فروغ دے سکتے ہیں اور اسکول واعلیٰ تعلیم کے ذریعے ہندوستانی زبان کو فروغ دینے کی حوصلہ افزائی کر سکتے ہیں۔ مقامی یا کسی ہندوستانی زبان کو فروغ دینا ممکن ہے اگر انہیں باقاعدگی سے بولا جائے اور تدریس میں استعمال کیا جائے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں شامل زبان سے متعلق پہلوؤں پر بالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکتسابی مواد کی تیاری، اساتذہ کی تربیت، اختراعی طریقوں کو اپنانا، ٹکنالوجی کا درست استعمال اور زبان کے تئیں مثبت رویہ کی ترقی اور ان کی قابل ذکر اہمیت کو سمجھتے ہوئے اسے فروغ دینا ہے۔

زبان کی اہمیت:

زبان ایک الٰہی تحفہ ہے جسے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے اور ایک قیمتی اثاثہ ہے جو متعدد کام انجام دیتی ہے۔ لوگ زبان کو ایک ذریعہ کے طور پر حاصل کرتے ہیں پھر یہی زبان بات چیت کے لیے اور انسانی سوشل علامت کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ دعوے کرنے، معلومات پھیلانے اور سماجی تعلقات کو برقرار رکھنے کا بھی کام کرتی ہے۔ یہ خیالات، جذبات اور تجربات کے تبادلے کے لیے ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ تاہم، کسی بھی زبان کو سیکھنے کا بنیادی مقصد مؤثر بات چیت کرنا ہے۔ جیسے کہ سپیر (1921) نے کہا: "زبان ایک خالصتاً انسانی اور غیر فطری طریقہ ہے، جس میں خیالات، جذبات اور خواہشات کو رضا کارانہ طور پر پیدا کردہ علامات کے نظام کے ذریعے بات چیت کی جاتی ہے۔ یہ علامات پہلے سمعی ہوتی ہیں اور یہ نام نہاد اعضائے کلام کے ذریعے پیدا کی جاتی ہیں۔" اگروال (2003) نے کہا کہ "زبان ایک علامتی نظام ہے جو ایک یا زیادہ لوگوں کے ذریعہ ایک ہی طریقے سے استعمال کی جاتی ہے، جو اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔" "زبان ایک شخص کے خیالات اور نظریات کا حامل ہوتی ہے جو انہیں شکل دینے میں مدد کرتی ہے۔ زبان نہ صرف بات چیت کا فریضہ انجام دیتی ہے بلکہ یہ بات چیت کے لیے بہترین آلہ بھی ہے،" لکھیرا وغیرہ۔ (2017)۔

مواصلاتی مہارتیں:

21ویں صدی میں کامیابی کے لیے مواصلاتی مہارتیں ضروری ہیں۔ایک عالمی سطح پر مربوط دنیا میں، ضروری ہے کہ کوئی شخص مختلف ثقافتوں اور پس منظر کے لوگوں کے ساتھ مؤثر طریقے سے بات چیت کر سکے۔ہمیں مختلف فارمیٹس میں بھی واضح اور مختصر طور پر بات چیت کرنے کے قابل ہونا چاہیے، جن میں لکھنے، بولنے اور ٹیکنالوجی کا استعمال شامل ہے۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 مواصلاتی مہارتوں کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے اور طلباء میں ان کی ترقی پر زور دیتی ہے۔ پالیسی میں اصلاحات کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا ہے جو طلباء کی مواصلاتی مہارتوں کو بہتر بنانے کے لیے بنایا گیا ہے، جن میں شامل ہیں: تجرباتی اکتساب اور عملی منصوبوں پر زور، بین الموضوعاتی تعلیم اور تعاون پر زور، نصاب میں ٹیکنالوجی کا انضمام۔اس سے طلباء کی مواصلاتی مہارتیں حقیقی دنیا کے تناظر میں بہتر ہوں گی ساتھ ہی طلباء مختلف پس منظر اور مضامین کے لوگوں کے ساتھ مؤثر بات چیت کے قیمتی تجربے حاصل کریں گے مزید یہ طلباء کو ڈیجیٹل خواندگی اور مختلف تکنیکی فارمیٹس میں مواصلاتی مہارتیں تیار کرنے میں مدد دے گا۔مواصلات کا مطلب دوسروں کے ساتھ بات چیت کرنا ہے جہاں بولنے سے پہلے سننا ضروری ہے۔فاطمہ وغیرہ (2019) نے نتیجہ اخذ کیا کہ زبان سیکھنے کا بہترین طریقہ چار زبان کی مہارتوں یا لسانی مہارتوں کی ترقی کے ذریعے ہے جو کہ سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہیں۔ یہ لسانی مہارتیں زبان کی مہارت کو بہتر بنانے کے لیے بہت اہم ہیں۔سننا اور پڑھنا قبولیاتی مہارت کے طور پر جانا جاتا ہے، جبکہ بولنا اور لکھنا اظہاری مہارت کے طور پر جانا جاتا ہے۔سننا جملوں میں ظاہر کیے گئے خیالات اور احساسات کو سمجھنے کا عمل ہے اور یہ بات چیت کے عمل کا ایک اہم حصہ ہے، جبکہ بولنا ایک تعامل کا عمل ہے جس میں معنی کی تعمیر شامل ہوتی ہے، جس میں معلومات پیدا کرنا، وصول کرنا اور پروسیسنگ کرنا شامل ہوتا ہے۔ پڑھنے کی مہارت کی حیثیت زبان سیکھنے میں بہت اہم ہے اور یہ الفاظ کی شناخت، نحوی تجزیہ اور تحریری فہم کا ایک شعوری عمل ہے جبکہ لکھنا تخلیقی صلاحیت کا اظہار ہے۔

سننے کی مہارتیں:

سننا بنیادی لسانی صلاحیت ہے۔اس کا تعلق ماحول سے ہے۔ایک بچہ اس ماحول کی زبان بولنا شروع کرتا ہے جس میں وہ پیدا ہوتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بچہ وہی زبان بولنا سیکھتا ہے جو وہ سنتا ہے۔سننا بولے جانے والے جملوں میں بیان کیے گئے خیالات اور احساسات کا ادراک ہے۔ دوسرے لفظوں میں بولنے والے کے پیغام کو وصول کرنے، اس کی تشریح کرنے اور اس پر

ردعمل ظاہر کرنے کے عمل کو سننا کہا جاتا ہے۔ لاکھیرا (2017) نے کہا کہ "سننا ایک ایسا عمل ہے جس میں سننا، سمجھنا اور فیصلہ کرنا شامل ہے، سننے کا مطلب اسپیکر کے الفاظ اور پیغامات سے معنی نکالنا ہے۔" شرما (2011) کا کہنا ہے کہ سمجھنا، برقرار رکھنا اور جواب دینا سننے کے تین بنیادی پہلو ہیں۔ تیاگی، بی (2013) کے مطابق، سماعت کے عمل کے پانچ الگ الگ مراحل ہیں سننا، سمجھنا، یاد رکھنا، اندازہ لگانا اور جواب دینا۔

سننا سماعت کے عمل کا ابتدائی مرحلہ ہے، جو کان کے ذریعے آوازوں کے حصول کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ایک جسمانی عمل ہے جس میں ردعمل کان کے حسی اعضاء کو متحرک کرنے والی آواز کی لہروں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگلا مرحلہ تفہیم ہے، جو کہ دیکھی اور سنی ہوئی علامتوں کی سمجھ ہے۔ تیسرا مرحلہ یاد رکھنا ہے، جس میں کسی کے ذہنی ذخیرے میں سنی گئی باتوں سے اخذ کردہ معنی شامل کرنا شامل ہے۔ ایک شخص جو سماعت کرتا ہے وہ نہ صرف پیغام کو قبول کرتا اور سمجھتا ہے بلکہ اسے واضح بھی کرتا ہے۔ دماغ میں پیغام کو وصول کرنا، واضح کرنا اور محفوظ کرنا وہی ہے جو یاد رکھنے میں شامل ہے۔ چوتھا مرحلہ تشخیص کرنا ہے۔ جہاں ایک فعال سامع شواہد کا تعین قدر کرتا ہے، حقیقت کو رائے سیا لگ کرتا ہے اور پیغام میں تعصب کی موجودگی یا عدم موجودگی کی نشاندہی سیکرتا ہے۔ آخری مرحلہ جواب دینا ہے؛ جو صورت حال کی نوعیت پر منحصر ہے، وصول کنندہ زبانی یا غیر زبانی جواب دیتا ہے۔

سننے کی مہارتوں کی اہمیت:

- سامعین مؤثر طریقے سے بات چیت کرنا سیکھ سکتے ہیں۔
- ایک شخص مؤثر سماعت کے ذریعے پیغامات اور معلومات پر ردعمل ظاہر کرنے کے قابل ہوتا ہے۔
- سننے والا سوالات کے جوابات دینے کے قابل ہوتا ہے۔
- سامعین دوسروں کے ساتھ مؤثر شرائط اور تعلقات قائم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔
- پیغام اور معلومات کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لیے سماعت کی مہارتیں بہت اہم ہیں۔
- مؤثر سماعت کی مہارتیں سننے والے کو پیغام اور معلومات کا تعین کرنے کے قابل بناتی ہیں۔
- سامعین پیغام اور معلومات کو یاد رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔
- سامعین مختلف مسائل اور چیلنجوں کا حل فراہم کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔
- یہ شخصیت کو بہتر بنانے میں مدد فراہم کرتی ہیں۔

بولنے کی مہارتیں:

کسی زبان کو بولنے کے لیے ایک شخص کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اور جملوں کے ڈھانچے سے واقفیت ہونی چاہیے۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کی بنیادی مہارتیں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہیں جن پر مشق اور زبان پر مسلسل نمائش ضروری ہے۔ سیکھنے سے ان مہارتوں میں کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ بولنا ایک شخص کی زندگی کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ "بولنا معانی کی تعمیر اور ان کے اشتراک کا عمل ہے، جو مختلف سیاق و سباق میں زبانی اور غیر زبانی علامتوں کے استعمال کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ معنی کی تعمیر کا ایک تعاملی عمل ہے جس میں معلومات پیدا کرنا، وصول کرنا اور پروسیسنگ کرنا شامل ہے" (شروف، این ڈی)۔ بولنے میں حاصل کی گئی مہارتیں تحریر اور مطالعہ میں منتقل ہوتی ہیں۔ یہ تعلیمی کیریئر میں بار بار ان صلاحیتوں کو استعمال کرنے کے لیے لاگو کیا جا سکتا ہے۔ نوٹ کیا گیا ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے لیے کسی زبان کا علم اس زبان کو بولنے کی صلاحیت کے مترادف ہے کیونکہ انسانی بات چیت کا بنیادی ذریعہ تقریر ہے۔ بولنے کی مہارتیں بہتر مواصلات کے لیے ایک بہت ہی اہم جزو سمجھی جاتی ہیں۔

بولنے کی مہارتوں کی اہمیت:

- الفاظ کو واضح طور پر تلفظ کرنے کی صلاحیت حاصل کرنا۔
- مؤثر طریقے سے بات چیت کرنے اور اپنی ضروریات، خواہشات اور احساسات کو آسانی سے ظاہر کرنے کی صلاحیت۔
- مناسب ہدایت دیتے وقت واضح اور فصیح بات چیت کرنے کی صلاحیت۔
- بولنے کا انداز طرز بیان کہلاتا ہے۔ یہ انداز دلچسپ اور دلکش ہونا چاہیے۔
- اظہار کے دوران ایک جملے کو دوسرے سے جوڑنا اور پورے واقعے یا معلومات کو مربوط انداز میں بیان کرنا گفتگو میں زندگی لاتا ہے اور آسانی سے سمجھا جاتا ہے۔
- ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے ظاہر کرنے کی صلاحیت، ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے کہنے کی صلاحیت ایک اچھے مترجم کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔
- مسلسل و منطقی تقریر کی صلاحیت مشق کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔
- مناسب رفتار اور وقفے کے ساتھ بولنا مؤثر گفتگو کی علامت ہے۔

پڑھنے کی مہارتیں:

پڑھنے کی صلاحیت کی حیثیت زبان کی تدریس کے مرکز میں ہے۔ یہ زبان سیکھنے کی چار بنیادی مہارتوں میں سب سے اہم صلاحیت ہے۔ سننا اور بولنا بے شعور یا قدرتی طور پر سیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک

پڑھنے کا تعلق ہے، یہ مشق اور محنت کا ایک شعوری عمل ہے۔ (لکھرا، 2017) نے بیان کیا کہ ایک طالب علم پڑھنے کی مہارت کے ذریعے مطبوعہ متن سے معلومات کو سمجھنے اور حاصل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ طلباء کے تعلیمی کیریئر کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی کی صورت حال میں پڑھنے کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پڑھنے کا مطلب دیکھنا، پہچاننا اور الفاظ کو بولنا ہے۔ پڑھنے کا عمل پوشیدہ یا چھپی ہوئی تحریری علامتوں اور ان کی آوازوں کا ادراک پیدا کرتا ہے۔ الفاظ کی شناخت، نحوی تجزیہ اور تحریری فہم کا عمل پڑھنا کہلاتا ہے۔

پڑھنے کی مہارتوں کی اہمیت:

- تنقیدی اور تخلیقی سوچ کو فروغ دینا۔
- متن کے بنیادی خیال یا اس کی روح کو پہچاننا۔
- پڑھنے کی صلاحیتوں کو بہتر بنانا۔
- الفاظ کے ذخیرے کو بڑھانا۔
- پڑھنے کی مہارتوں کو بہتر بنانا۔
- موضوع کی عمومی سمجھ بوجھ حاصل کرنا۔
- موزوں زبان کا استعمال کرنا۔
- روانی اور تسلسل کے ساتھ پڑھنا جاری رکھنا۔

لکھنے کی مہارتیں:

زبان سکھانے کے چار بنیادی مقاصد سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا ہیں۔ ان زبان کی مہارتوں (LSRW) میں سننا اور پڑھنا نظریاتی نوعیت کے ہیں جبکہ بولنا اور لکھنا عملی ہیں۔ لکھنا ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک شخص اپنے خیالات کو علامتوں، یعنی حروف اور الفاظ کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ لکھنا تخلیقی اور ثقافتی زندگی کا اظہار اور شخصیت سازی کی ایک شکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریری ترقی زبان کی تعلیم میں ایک کلیدی عنصر ہے۔

لکھنے کی مہارتوں کی اہمیت:

- تحریر کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینا۔ انسان اپنے جذبات، خیالات، معلومات اور احساسات کو بولنے یا لکھنے کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔
- تصورات کا جائزہ لینے اور فیصلے کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینا۔

- خطاطی میں ہدایت فراہم کرنا تاکہ طلباء علامتوں کے استعمال کے ذریعے اس فن میں مہارت حاصل کرسکیں۔
- درست اور واضح بات چیت کی صلاحیت بڑھانے کے لیے مناسب گرائمر کا استعمال کرنا۔
- درست الفاظ اور جملوں کی تشکیل کے ساتھ لکھنے کی عادت کو فروغ دینا۔
- ہجے پر ہدایت دینا کیونکہ ہجے الفاظ کی درست تصویر بنانے کے لیے صحیح حروف کا استعمال ہے۔ ہجے لکھنے کی مہارتوں کو بہتر بنانے کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔
- جلدی، صاف اور درست طریقے سے لکھنے کی عادت کو فروغ دینا اور خود اعتمادی کے احساس کو بھی بڑھانا۔

نتیجہ:

21ویں صدی کی تعلیم کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے، مواصلاتی مہارتوں کی بہتری مؤثر بات چیت کے لیے ضروری ہے۔ زبان کی مہارتیں مؤثر اور مضبوط مواصلاتی مہارتوں کے لیے بہت اہم اور ضروری کردار ادا کرتی ہیں۔ زبان کی چار بنیادی مہارتیں سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا مختلف طریقوں سے بہت اہم ہیں۔ سننے کی مہارتیں زبان کی حصولی، پیشکش کے انداز، گفتگو، شخصی تعاملات اور عوامی اعلانات کے لیے حاصل کی جاتی ہیں، جبکہ بولنے کی مہارتیں مباحثے، بحث، انٹرویو، اور ٹاک شوز میں شرکت کے ساتھ ساتھ تعلیمی ادارے کے دیگر اراکین کے ساتھ تعامل کے لیے مددگار ہوتی ہیں۔ پڑھنے کی مہارتیں باقاعدگی سے نصابی کتابوں کو پڑھنے اور پیراگراف میں استعمال ہونے والے الفاظ کی نوعیت پر توجہ دینے سے بہتر ہوتی ہیں۔ دوسری طرف، لکھنے کی مہارتیں موجودہ موضوعات، روزانہ کی ڈائری لکھنے کی عادت، متن کی تشریح کرنے اور اردگرد کے حالات کے بارے میں لکھنے کے لیے ضروری ہیں۔ مجموعی طور پر قومی تعلیمی پالیسی 2020 زبان کی مہارتوں کی بہتری، تعلیمی اداروں میں کثیر لسانیت، زبان کے انتخاب کی گنجائش، سیکھنے میں ٹیکنالوجی کے استعمال اور ان کے فروغ پر زور دیتا ہے۔ کسی کی زبان اور ثقافت کا احترام قوم میں تبدیلی کو فروغ دے گا۔ یہ ہماری ذمہ داری ہونی چاہیے کہ ہم اپنے اسلاف سے وراثت میں ملنے والی لسانی و عملی مہارتوں کو محفوظ رکھیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ ہم انہیں آنے والی نسلوں تک لے جائیں۔ ہم اسکول اور اعلیٰ تعلیم کے ذریعے ہندوستانی زبان کی حوصلہ افزائی کرکے جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنی زبان، فن اور ثقافت کو محفوظ رکھتے ہوئے فروغ دے سکتے ہیں۔ ہندوستانی زبان کا فروغ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب

انہیں باقاعدگی سے بولا جائے اور تدریس میں استعمال کیا جائے۔

حوالہ:

آچاریہ ایس (2023) رول آف این ای پی ین ملٹی لینگول ایجوکیشن اینڈ دی پاور آف لینگویج۔ انٹرنیشنل جرنل آف کریٹیو ریسرچ تھاٹس۔ والیوم 11 ایشیو 12 دسمبر 2023۔

استھانا ایس وی (2024) دی نیڈ فار کمیونیکیٹیو انگلش ان این ای پی۔ انٹرنیشنل جرنل آف ناول ریسرچ اینڈ ڈولپمنٹ۔ (آئی جے این آر ڈی) والیوم 9 ایشیو 2 فروری 2024۔

اگروال آر (2003) ایفیکٹیو کمیونیکیشن اسکلس۔ سلائم پبلیکیشنس جے پور۔

فاطمہ ایم اور کمار بی کے (2019) انفلوینسنگ دی ایل ایس آر ڈبلیو میتھڈس ان تیلنگانہ اسکولس وتھ ریفرنس ٹو سوشیو لاجیکل فیکٹرس۔ پرمانا ریسرچ جرنل، والیوم 9 ایشو 20191۔

لکشمن کمار ایس (2022)۔ نیو ایجوکیشن پالیسی اینڈ انہینسمنٹ آف انگلش لینگویج ٹیچنگ اینڈ لرننگ ان ریورل ایریا۔ انٹرنیشنل جرنل آف کری ایٹیو ریسرچ تھاٹس۔ والیوم 10 ایشو 6، 914۔919۔

لکھیرا ایچ اینڈ بسوال اے (2017)۔ اسٹریٹیجیز ٹو انہینس انگلش لینگویج اسکلس ان اسٹوڈنٹس ایٹ سیکنڈری لیول، انٹرنیشنل جرنل آف ملٹی ڈسپلنری ایپروچ اینڈ اسٹڈیز۔ والیوم 4 ایشیو 5 29۔36۔

نیو ایجوکیشن پالیسی (2020)۔ دی منسٹری آف ایجوکیشن، گورنمنٹ آف انڈیا۔ ریٹریوڈ فرام

www.education.gov.in/sites/upload_files/mhrd/files/NEP_Final_English_0.pdf//:https

نقوی ٹی ایف اینڈ ندیم اے (2018) اردو زبان کی تدریس وفہم، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

شروف ایف (این ڈی) ٹیچنگ اینڈ امپروونگ اسپیکنگ اسکل۔ فلاڈلفیا یونیورسٹی۔ ریٹریوڈ فرام

www.philadelphia.edu.jo/academics/fshrouf/uploads/speaking.pdf//:http

☆☆☆

Tariq Shabnam : Besimt Qafile ka Rahbar by S. Mashooq Ahmad

ایس معشوق احمد (کلگام) (Kulgam)cell-8493981240

طارق شبنم : بے سمت قافلے کا رہبر

طارق شبنم کا شمار کشمیر کے ان قلمکاروں میں ہوتا ہے جنہیں ستاروں سے آگے کے جہاں کی تلاش رہتی ہے اور جو افسانہ بننے کے عشق میں ہر امتحان سے گزرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ صنف افسانہ پر فریفتہ اور اردو زبان کے عاشق طارق شبنم نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے گمشدہ دولت میں اعتراف کیا تھا کہ ــــــ ''میں نہیں جانتا کہ میں لکھنے کے ہنر سے آشنا ہوں کہ نہیں، میرے قلم سے سیاہی ٹپکتی ہے کہ لہو، میں نے اچھا لکھا کہ برا''۔

ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ''بے سمت قافلے'' کا مطالعہ جن خوش قسمت قارئین نے کیا ہوگا وہ میری بات سے اتفاق کریں گے کہ طارق شبنم افسانہ بننے کے ہنر سے آشنا ہیں اور ایک درد آشنا افسانہ نگار ہیں جو لوگوں کے مسائل، ان کے دکھ درد، ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں سے غمگین ہوتا ہے اور اس غم اور فکر کو جب افسانے کا روپ دیتا ہے تو ان کے قلم سے سیاہی کے بجائے لہو ٹپکتا ہے۔ طارق شبنم اب برا لکھنے کی منزلوں سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں اور اب وہ افسانہ نگاروں کے اس کارواں کی قیادت کر رہے ہیں جو لگاتار صنف افسانہ کو فروغ دے رہے ہیں۔ طارق شبنم کے قلم سے یک بعد دیگرے بہترین افسانے تخلیق ہو رہے ہیں۔ طارق شبنم کے افسانے آدمی کو انسان بننے کا درس دیتے ہیں، نیکی کرنے پر ابھارتے ہیں، دوسروں کی مدد کرنے اور سکھ دکھ میں کام آنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے کے ولولے کو بالیدگی عطا کرتے ہیں۔ افسانہ شکور بھنگی کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کا مرکزی کردار ایک بیوہ کے لئے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے، اس کے گھر کا چولہا جلے، اس کے بچے تعلیم پائے اس کے لئے قرض لیتا ہے یہاں تک کہ چوری کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ کسی کی ریگستان جیسی زندگی میں امید کے پھول کھلانا، مجبوری کی جلتی آگ کو سہارے اور چارہ سازی کی بوندوں سے ٹھنڈا کرنا، جھلستی دھوپ میں سائے رحمت کی مانند آگے آنا نیکی اور بھلائی ہی تو ہے۔ شکور بھنگی ایک مجبور بیوہ پر احسان کرتا ہے اور بدلے میں یہ دعا پاتا ہے کہ رب اسے حج کی سعادت نصیب فرمائے۔ اس دعا کے طفیل شکور بھنگی کو لوگوں کی نظروں میں گناہ

گار ہونے کے باوجود حج جیسی سعادت نصیب ہوتی ہے اور مکمل حج کے بعد وہ سجدے میں قابل رشک حالت میں اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔لوگ شکور بھنگی پر رشک کرتے ہیں اور اس جیسی موت کی تمنا کرتے ہیں۔شکور بھنگی بیوہ کی مدد تو کرتا ہے لیکن کبھی اس کے گھر کی دہلیز پار نہیں کرتا بلکہ سامان باہر رکھ کر بیوہ کو بلاتا ہے۔افسانہ رخصتی میں نہ صرف ہندو مسلم بھائی چارے کی عکاسی کی گئی ہے بلکہ یہ بھی سبق دیا گیا ہے کہ کسی کی مدد کرنے کے لئے مذہب اور ذات پات نہیں دیکھی جاتی بلکہ انسان اور انسانیت کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے۔سرلا دیوی نہایت پریشان ہوتی ہے کیونکہ اس کی بیٹی لکشمی کی شادی میں بس دو دن رہ گئے تھے۔خراب حالات اور کرفیو کی وجہ سے وہ گھر سے باہر نہیں نکل پائی تھی اس لئے سارے انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔احسان احمد فرشتہ بن کر ضروری سامان، شادی کا جوڑا، بناؤ سنگھار کا سامان، واز وان میں کام آنے والی اشیاء، مشروبات اور دیگر چیزیں سرلا دیوی کے گھر لا کر باقی سارے انتظامات کو حتمی شکل دیتا ہے۔احسان احمد کے احسان سے رخصتی دھوم دھام سے ہوتی ہے اور یوں ایک مجبور ماں اپنی لاڈلی بیٹی کو خوشی خوشی وداع کرتی ہے۔افسانہ بابا سائیں کا مرکزی کردار قدرت اللہ جو بابا سائیں کے نام سے مشہور ہے لوگوں کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔شاکر کی مدد کرنے کے لئے بابا سائیں اپنا سونے کا مڈل کم قیمت پر فروخت کرتا ہے تاکہ شاکر کو مطلوبہ رقم مہیا کر سکے۔کشمیر کے قلمکاروں نے عصر حاضر کے نت نئے مسائل کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات اور قلبی واردات کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے اسی حد تک محدود نہ رہے بلکہ اردگرد کے ماحول ، یہاں کے قدرتی مناظر ، پہاڑ ، بیابان اور ندی نالوں، آبشاروں اور ریگ زاروں کی تصویر کشی سے بھی اپنے افسانوں کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے ۔طارق شبنم بھی پیچھے نہیں رہے ان کے ہاں بھی کشمیر کی خوبصورتی کی عکاسی، یہاں کے حالات ، یہاں کے رہن سہن، لوگوں کے مسائل، ان کے جذبات اور احساسات کا عکس دیکھنے کو ملتا ہے۔جس طرح تازہ ہوا کے جھونکے سے عطر مل جائے تو چاروں اور خوشبو پھیلتی ہے اسی طرح طارق شبنم کے یہاں موضوع اور اسلوب، زبان اور اس کے ورتاؤ سے ایسی مہک پیدا ہوتی ہے جو قاری کی طبیعت کو معطر اور شاد کرتی ہے۔افسانہ زخمی دلہن میں جہاں کشمیر کی خوبصورتی بیان ہوئی ہے وہیں اس خوبصورتی میں چار چاند لگانے والے جھیل ڈل کی ابتر صورتحال کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس خوبصورت دلہن کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں اور اس کا سارا جسم زخمی ہے۔اس خوبصورت جھیل کو زخمی کس نے کیا؟ اس سجی سجائی دلہن کو خودغرض عناصر نے نوچ نوچ کر کھایا ہے، اس کے شفاف پانی کو لوگوں نے گندہ کیا

ہے، تجاوزات اور تعمیرات نے اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اسے اپاہج بنا دیا ہے۔ طارق شبنم نے مسئلے کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی ہے اور اپنی ذمہ داری سے دست بردار ہو گئے ہیں۔ اب اعلیٰ حکام تک ہے کہ وہ قوم کے اثاثے کو کیسے بچائے اور جنت کو دوزخ نہ بننے دے۔ طارق شبنم جھیل ڈل کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں ___ ''قدرت کا کتنا انمول تحفہ ہے یہ، بے مثال کاریگری اور مصوری کا نادر شاہکار جس کے نام۔ پر لاکھوں دل ڈھڑکتے ہیں۔ اگر وادی فردوس بریں ایک دلہن ہے تو یہ خوبصورت جھیل بلاشبہ اس دلہن کے ماتھے کا جھومر ہے۔ نہیں۔۔۔۔ نہیں یہ پرکشش جھیل تو خود ایک دلہن کے مانند ہے جس کے حسن و جمال اور دلکشی کا کوئی ثانی نہیں۔۔''

طارق شبنم کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ یہاں گھریلو حالات سے لے کر قومی حالات تک اور قومی سے لے کر بین الاقوامی حالات تک کو موضوع بنایا گیا ہے اور انہوں نے اپنی بات آسان اور سادہ زبان میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے ٹھنڈا جہنم، پریم نگر، میٹھا زہر، بے سمت قافلے، کالا قلعہ، کالی ناگن، حی علی الفلاح وغیرہ پڑھ کر ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور یہ یقین بھی کہ وہ اس قافلے کی رہنمائی کر سکتے ہیں جن کو اپنی منزل کی خبر نہیں، جو لکھ تو رہے ہیں لیکن موثر لکھنے کے راز سے ابھی بے خبر ہیں۔ طارق شبنم نے ان کے لئے ان مٹ نشان چھوڑے ہیں۔ ان کے قدموں کے نشان اس بے سمت قافلے کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے کافی ہیں جو ادب کے میدان میں چل تو رہے ہیں لیکن ابتدا سے بے خبر اور انتہا سے لاعلم۔ کرشن چندر عصمت چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں ___ ''عصمت کا نام آتے ہی مرد افسانہ نگاروں کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ شرمندہ ہو رہے ہیں۔ آپ ہی آپ خفیف ہوئے جا رہے ہیں۔''

اسی سے ملتا جلتا خیال مجھے بھی آیا کہ طارق شبنم کا نام آتے ہی موٹی موٹی تنخواہیں پانے والے پروفیسروں اور اردو کا نوالہ کھانے والے بے مروتوں کو دورے پڑتے ہوں گے، ان کا نام سن کر ان نامہربانوں کی غیرت جو سو نہیں گئی بلکہ نیم مردہ ہو کر کوما میں چلی گئی ہے جاگ جانی چاہیے، ان کے کارناموں کو دیکھ کر انہیں شرمندگی محسوس ہونی چاہیے کہ اردو کی بدولت عہدہ، رتبہ اور عزت ملنے کے باوجود وہ بے مروت کیوں نہیں یوں اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں جیسے طارق شبنم ادب کی سیوا کر رہے ہیں۔ طارق شبنم کسی اسکول یا کالج میں اردو نہیں پڑھاتے پھر بھی اس زبان سے محبت رکھتے ہیں اور لگاتار لکھ رہے ہیں اور اس بے سمت قافلے کو صحیح راستہ دکھا رہے ہیں جو دور کسی صحرا میں اپنا راستہ بھٹک گیا ہے۔ ☆☆☆

Laddakh mein schooli talim ka manzarnama, pesh raft aur masael

by Fatima Zahra (Asst. Prof. MANUU CTE Srinagar)

فاطمہ زہرا (اسسٹنٹ پروفیسر، MANUU کالج اف ٹیچر ایجوکیشن، سری نگر)

لداخ میں اسکولی تعلیم کا منظر نامہ؛ پیش رفت اور مسائل

بھارت کی ازادی کے بعد تعلیم قومی ترقی کے لئے ایک اعلیٰ ترجیع رہی ہے۔ تعلیم کو سب کے لیے عام کرنے کی سمت میں اہم کوششوں کیبا وجود، مختلف علاقوں اور سماجی گروہوں کی تعلیمی رسائی غیر متوازی رہی ہے۔ دیہی اور شہری علاقوں میں تعلیمی رسائی میں واضح فرق ہے، جہاں جنس، ذات اور امدنی تعلیمی مواقع کے تعین میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔(Reddy,2010Sinha and) مزید برآں، بھارت کے تعلیمی نظام کو اس کی کم معیاری، غیر تسلی بخشساختی سہولیات، اور اساتذہ کیقلیل تربیت کے لیے تنقید کا سامنا رہا ہے، جسے اسکولی تعلیم کی رسائی میں دیہی اور شہری علاقوں کے فرق نے مزید بگاڑ دیا ہے۔(Muralidharanand Goyal and Priyanka, 2009; Kerner,2006) اس پس منظر میں، یہ مضمون مرکز کے زیر انتظام علاقہ لداخ میں اسکولی تعلیم کی صورتحال پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرے گا، جو کہ ایکقبائلی علاقہ ہے جہاں تقریباً 80٪ آبادی درج فہرست قبائل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تجزیہیو ڈائس ڈیٹا(2019 UDISE(2020-) سے حاصل کردہ اہم معیارات پر مرکوز ہوگا، جن میں اسکولوں کی دستیابی، داخلے کے رجحانات، اور بنیادی ڈھانچے کی سہولیات شامل ہیں۔

لداخ میں جدید تعلیم کا آغاز عیسائی مشنریوں سے ہوتا ہے، جنھوں نے اپریل 1887 میں لیہہ میں علاقے کا پہلا جدید اسکول قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے (2005،Bray)۔ بھارت کی آزادی کے بعد، لداخ کو مختلف تعلیمی بورڈز، بشمول جموں و کشمیر بورڈ آف اسکول ایجوکیشن (JKBOSE) اور سینٹرل بورڈ آف اسکول ایجوکیشن (CBSE) کے تحت، وسیع بھارتی تعلیمی نظام میں ضم کیا گیا۔ 1943 کے تاریخی ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے کہ لداخ وزارت، جس میں سکردو بھی شامل تھا، میں 63 پرائمری اسکول، دو بنیادی اسکول، تین پاٹھشالہ اور 10 مکتب شامل تھے

(Beek،2003)۔ یوڈائس (20192020۔) کے مطابق اج، لداخ میں اسکولوں کی تعداد بڑھکر 1,048 ہو چکی ہے، جن میں سے 907 سرکاری اسکول اور باقی 141 نجی اسکول ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں کے دوران، حکومتِ ہند نے لداخ میں ابتدائی تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کے لیے نمایاں کوششیں کی ہیں۔ 2005۔2006 میں سرکاری اسکولوں کی تعداد 745 اور نجی اسکولوں کی تعداد 85 تھی، جو 2019۔2020 تک بڑھ کر 907 سرکاری اور 141 نجی اسکولوں تک پہنچ گئیہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ، اس علاقے کے دور افتادہ جگھوں میں بھی نجی اسکولوں کے قیام میں نمایاں اضافہ دیکھا گیا ہے۔

اسکولوں کی اس توسیع کے ساتھ طلبا کے داخلے میں بھیخا طرخواہ اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت لداخ بھر کے اسکولوں میں 43,920 طلبا زیر تعلیم ہیں، جن میں سے 23,724 نجی اسکولوں میں جبکہ 20,196 سرکاری اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں Trend in enrolment:Figure 1

Management Wise) in Schools in Ladakh 2005 source UDISE

اگرچہ مجموعی طور پر داخلے میں اضافہ ہوا ہے، لیکن شہری علاقوں میں نجی اسکولوں میں داخلے سرکاری اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم، داخلے کے رجحانات میں ایک صنفی تفاوت بھی نظر آتا ہے، خاص طور پر دیہی علاقوں کے نجی اسکولوں میں لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کا اندراج کم پا گیا ہے۔ اس کے برعکس، دیہی علاقوں سے تعلق رکھنے والی لڑکیوں اور مالی طور پر پسماندہ پس منظر کے طلبا کا رجحان زیادہ تر سرکاری اسکولوں کی جانب دیکھا گیا ہے۔

Locality-wise, Gender and Management:Figure 2

Student Enrolment 2019 Source UDISE

لداخ میں گرچہ اسکولوں کی تعداد کافی ہے اور داخلے کی شرح میں بھی اضافہ ہو رہا ہے، اس کے باوجود علاقے کے مجموعی داخلہ تناسب (GER) اور خالص داخلہ تناسب (NER) سے مربوط مسائل اب بھی موجود ہیں۔ جیسا کہ آگے جدول میں دکھایا گیا ہے۔ لداخ میں اعلیٰ ابتدائی تعلیم کے لیے GER اور NER قومی اوسط سے کافی نیچے ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بہت سے طلبا اعلیٰ سطح کی تعلیم حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔

20۔Level-wise GER and NER for the year 2019:Table 1

Upper Primary Primary Region

	GER	NER	GER	NER
Ladakh	82.9	67.9	67.9	48.5
India	102.7	91.4	89.6	71.1

Source: UDISE 2019

ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف توجہ رکھنا بھی لازمی ہے کہ نجی اسکولوں کے داخلہ میں کافی اضافہ ہو رہا ہے، جبکہ سرکاری اسکولوں کیداخلوں میں ایک کمی واقع ہوئی ہے۔اس حوالے سے توجہ اس بات پر بھی مرکوز کرنی چاہئے کہ سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا مختلف قسم کے پسماندہ گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات سامنے آئی ہے کہ درج فہرست قبائل سے تعلقہونے کے علاوہ سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم طلبا میں خاص طور پر لڑکیاں ہیں اور دیہیپس منظر سے تعلق رکھنے والے وہ طلبا ہیں جنکا تعلق مالی طور پر کمزور طبقے سے ہے۔

لداخ میں سرکاری اسکول، جو کہ ان پسماندہ گروہوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، شدید بنیادی ڈھانچے کی کمی کا شکار ہیں۔ نجی اسکولوں کے مقابلے میں، سرکاری اسکول خاص طور پر ضروری سہولیات فراہم کرنے کے معاملے میں پیچھے ہیں۔تقریباً50% سرکاری پرائمری اسکولوں میں دیوار بندی نھیں ہے، جبکہ صرف 17% سرکاری اعلیٰ ابتدائی اسکولوں میں پختہ دیوار بندی کی گئی ہے۔اس کے برعکس 40 % نجی اسکولوں میں یہ سہولیت فراہم ہے۔ مزید برآں، صرف 57 % سرکاری اسکولوں میں کمرہ جماعت اچھی حالت میں موجود ہیں، جبکہ نجی اسکولوں میں یہ شرح 92% ہے۔ کمرہ جماعت کے معیار کے علاوہ، اس علاقے میں نجی اسکول بنیادی ڈھانچے کے زیادہ تر معیاروں پر سرکاری اسکولوں کی نسبت بہتر نظر آتے ہیں۔ تاہم، سرکاری اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے بیت الخلا کی سہولیات کی صورت حال زیادہ بہتر ہے۔ پینے کے پانی کی دستیابی کے حوالے سے، تقریباً60% سرکاری اسکولوں میں مناسب سہولیات موجود ہیں، جب کہ نجی اسکولوں میں یہ شرح 80 % سے زیادہ ہے۔اس کے علاوہ، 50% سے کم سرکاری اسکولوں میں لائبریریاں ہیں، جبکہ 70% سے زیادہ نجی اسکول کتب خانوں سے لیس ہیں۔ ٹیکنالوجی تک رسائی کے لحاظ سے، صرف 23 % سرکاری اسکولوں میں کمپیوٹر موجود ہیں، جبکہ 66% نجی اسکول یہ سہولت فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی ڈھانچے کی اس کمی کا مسئلہ خاص طور پر ڈیجیٹل دور میں تشویش کا باعث ہے، جہاں معلومات اور مواصلات کی ٹیکنالوجی (ICT) عالمی سطح پر تعلیم میں ایک تبدیلیکا کردار ادا کرتی ہے۔ لداخ کے

زیادہ تر سرکاری اسکولوں میں انٹرنیٹ کی سہولیت تک رسائی نہیں ہے، اور بہت کم ایسے اسکول ہیں جو کمپیوٹر یا بجلی سے لیس ہیں۔ حتیٰ کہ اس علاقے کے نجی اسکول بھی غیر مکمل ICT بنیادی ڈھانچے کا شکار ہیں۔

نتیجے کے طور پر، اگرچہ اسکولوں کا قیام تعلیم تک رسائی کو بہتر بنانے کی راہ میں ایک اہم قدم ہے، لیکن یہ امر بنیادی ڈھانچے کی کمی کو دور کیئے بغیر کارآمد نہیں ہے، جس کے چلتے معیاری تعلیم کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ لداخ جیسے علاقے کے لیے، جسے منفرد جغرافیائی اور سماجی و ثقافتی مسائل کا سامنا درپیش ہے، میں معیاری تعلیم تک منصفانہ رسائی کو یقینی بنانے کے لیے خاص طور پر سرکاری اسکولوں کے بنیادی ڈھانچے پر توجہ دینا اشد ضروری ہے۔ ایسی پیش رفت کے بغیر، اکیسویں صدی میں تعلیمی شمولیت کا وعدہ خاص طور پر لداخ کے بہت سے پسماندہ طلبا کے لیے پورا نہیں ہو پائے گا۔

References:

Quality and Coverage:Primary Education in India.(2004)Bajpai. N and Goyal. S.

Issues. Center on Globalization and Sustainable Development.

"Communal" Conflict in Ladakh and:Beyond Identity Fetishism.((2000Beek.V.M

pp.,(2000Nov.,)No. 4of Autonomy. Cultural Anthropology, Vol. 15, the Limits

569.-525

Local and Regional:Locating Ladakhi History. Ladakhi Histories.(2005)Bray, J.

Perspectives.

UDISE. National Institute of Education Planning.(2016-(2005District Report Card

and Administration, New Delhi.

How Do Government and Private Schools Differ?.((2009&Pandey. PGoyal. S

Findings from Two Large Indian States. South Asia human development sector

World Bank, Washington, DC.series; no. 30.

Private and Public Schools in Rural',(2006)and Kremer, M.Muralidharan, K.,

Harvard University.,'India

☆☆☆

رواج زبان فارسی در کشمیر در قرون چهاردهم و پانزدهم

ڈاکٹر اختر حسین شاہ cell-9697126910

درنیم اول قرن چہاردهم سید عبدالرحمن سہروردی ترکستانی ملقب بہ شرفِ الدین ومعروف بہ بلبل شاہ کہ استقرار حکومت اسلامی در کشمیر محض بنام اومربوط است. مچون ستاردرخشان درافق این سرزمین تجلی کرد. این شخص درتفکر مردم کشمیر گردش کلی بوجودآورد. محض بانفوذ وتبلیغ ورابری اوحاکم کشمیر, رتنجوک اورارتنچن نیزمی گفتند, از دین بودایی روگردانیدرسما دین اسلام راقبول کرد. درواقع این دوررا می توان مچون آغاز حقیقی سلطنت اسلامی در کشمیر معرفی نمود, درباروج گرایش رتنچن بدین اسلام نقل م آورداندک مختصر آن بدین طریق است.

وقتی کہ بلبل شاب کشمیر آمداو درکنار دریای جی لم جای گرفت کہ درساحل مقابل آن قصر رتنچن واقع بود. باری سحری زودرتنچن باشنیدن صدای اذان بلبل شابیدارگشت واوراسرنماز دید. شنیدن صدای » الل اکبر « چنان روح رتنچن رانوازش کردک اوبی اختیارنزدبلبل شارفت وبااوم صحبت شدواز مذب اوپرسید. پس از آشنای باتعلیم عالی دین اسلام ورفع شک وگمان ایش رتنچن ب این دین ایمان آوردوسلطان صدرالدین نام گرفت. » طلوع آفتاب محمدی « مطابق ب سال 726 ہجری/ 1324م. تاریخ روی آوردن رتنچن بہ دین اسلام است.

پس ازب دین اسلام گرویدن وسلطان صدرالدین نام گرفتن رتنچن، بہ دنبال اون تن ا ال خانواده وخویشاوندان وعده ای ازاعیان واشراف کشمیر دین اسلام راقبول نمودند، بلکہ زاراتن از کشمیریان نیزب سعادت اسلام مشرف گردیدندک تعداد آن ارامفتی محمد سعادت زارنفرنوشت است. سلطان صدرالدین اولین حکمران کشمیرمی باشدک حکومت اسلامی رادراین سرزمین برقرارنمودو حکومت نددرکشمیرخاتم یافت. بہ طوری کہ معلوم می شود،نفوذ اسلام درکشمیرخصوصیت اجباری نداشت و ن بہ راضرب شمشیرواشغال کشور، زورآوری وخونریزی ومقابلت شدید با مردم برای نفوذ عقاید بیگان و ن ازراندوستان ک درآن زمان تحت سلاطین تغلقی بود، بلک کاملا مستقیم وصلح آمیز، بدون جوروستم وارد شد. این واقع مم ہیچ عنصر خارجی دربرنداشت، بلک نتیج اوضاع داخلی نامساعد کشمیر بودک حتی ازقرن یازدم روبہ تنزل بودواین احوال تا آغاز قرن پانزدم ادام داشت. دراین زمان کشمیراز لحاظ اقتصادی و

اجتماعی نسبت ب دیگر مناطق ندوستان شمالی خیلی عقب ماند بود. روند گذر ب جامع فتودالی در اینجا خیلی سست جریان گرفت. ومردم کشمیر در جستجوی چنین قوای بودند ک در کشور امنیت وآسایش را برقرار نماید این صورت حال برای گسترش اسلام در این سرزمین را آراموار کرد. یکی از عامل ای مم گرایش ااالی ندو مذب کشمیر ب اسلام تقسیم جمعیت ب کاست و طبقات مختلف نیز محسوب می شود. در این زمین بود ک نمایندگان طبق ای پایینی برای نجات یافتن از استبداد طبقاتی ب دین ندوی اعتراض نمود، به دین اسلام روی می آوردند. اگرچ تعاملات کشمیر با مسلمانان چندقرن پیش آغاز یافت بود اماتن ابا آمد بلبل شا در کشمیر حکومت اسلامی استقرار یافت. این نکت را نیز باید تذکر داد ک ر چند دین اسلام در کشمیر نسبت به مناطق دیگر ندوستان دیرتر انتشار یافت، ولی به زودی در این قلمرو آن چنان وسعت پیدا کرد ک در یچ گوشه ای از ند از چنین وسعتی برخوردار نیست. پش از وفات سلطان صدرالدین ک ۲ سال و فت ماعنان حکومت را در دست داشت، شامیرزا ک در دور حکمرانی سلال شامیری آغاز شد. سلطان شمس الدین در دور حکمرانی خود پراکندگی مملکت را برم داد. من بعدا بیش از دو قرن (1349 ـ1561) نمایندگان خانوادشامیری در کشمیر حکمرانی نمودند.

پس از وفات سلطان صدرالدین ک دو سال وفت ماعنان حکومت را در دست داشت، شامیرزا ک در دور حکمرانی او در حکومت کشمیر مقام بلندی داشت و بالاخروزیر سلطان گشت بود، در مبارزای بین خودی پیروز شد، به نام سلطان شمس الدین بر تخت کشمیر نشست و حکمرانی سلسل شامیری آغاز شد. سلطان شمس الدین در دور حکمرانی خود پراکندگی مملکت را برم داد. من بعد بیش از دو قرن (1349 ـ1561) نمایندگان خانوادشامیری در کشمیر حکمرانی نمودند.

یکی از واقع ای م ی که در دور حکمرانی شامیریان ب وقوع پیوست، ورود عارفان زیادی از نقاط مختلف آسیای مرکزی و ایران به کشمیر بود که برای تعلیم و تبلیغ دین اسلام به این سرزمین قدم گذاشتند ومردم این خطه را مورد دایت قرار دادند، خصوصا فعالیت ای عارفان بزرگ امثال میر سید علی مدانی، میر محمد علی مدانی و میر شمس الدین عراقی در ترویج و گسترش کامل دین اسلام در این سرزمین تاثیر فراوانی داشت. فعالیت این عرفا برای گسترش زبان فارسی در کشمیر نیز زمین خوبی فرام آورد. مزمان با ترویج و گسترش کامل دین اسلام در کشمیر زبان و ادبیات فارسی که خود وسیل تبلیغ فرنگ اسلامی در این سرزمین محسوب می گشت، خیلی تکامل یافت.

مورد تذکر است که مردم کشمیر تا این زمان با زبان فارسی آشنایی داشتند، اما در نتیج حکمرانی

سلسل ای مسلمان و ورود عارفان بزرگ، سخنوران و دانشمندان فارسی زبان، زبان فارسی در این سرزمین نفوذ زیاد پیدا نمود به حلق خاص و عام در آمد، در محافل ادبی محبوبیت زیادی پیدا کرد و بتدریج مچون زبان کارگزاری و علم و ادب مقام زبان فرنگی کشور را به دست آورد. زبان سنسکریت که در زمان حکمرانی کنیشک (سداول میلادی) وارد این سرزمین شد و در زمان حکومت راج ای کشمیر و برای یک دور معین درع دسلاطین شامیری زبان رسمی این سرزمین بود و در طول قرن اسخن سرایان کشمیری چون کشیمیندر، سامدیو، کل نہم انندوردن، اب ینوگوپن، بسکر، سامنند، اتپل چری و دیگران اثرای گران ب ای دینی و فلسفی و علمی و ادبی به این زبان ت لیف نمود بودند، جای خود را به فارسی داد. در زمان سلطان ش اب الدین (1354 ـ 1373) زبان سنسکریت جای خود راب زبان فارسی داد.

اگر چہ زبان فارسی تن ادر قرن چ ار دوارد کشمیر گشت اما در این جا موقعیت خیلی قوی پیدا نمود، در طول ٦ قرن گذشت از این خطہ آن قدر عالم و شعر فارسی گو بر خاستند ک تاریخ چنین ادوار پربار معنوی را کم در خاطر دارد. گسترش زبان فارسی و تجلی آن آنچنان ب بلندی رسید کہ حتی پندیت ای کشمیر آن را چون زبان علمی و ادبی اختیار نمودند و بعضی از کتب دینی خود را م بہ زبان فارسی نوشتند. مچنان ک لاور را» اصف ان ثانی «و» غزنین خرد «می گفتند، کشمیر را» ایران صغیر «می نامیدند. این افتخار فقط نصیب کشمیر شد است و این بی سبب نیست. بہ قول خواج عبدالحمید عرفانی:

» در تاریخ ج ان کمتر نظیر دارد ک یک ملت بوسیل تدریس و تعلیم زبان خارجی را یاد بگیرد و در آن زبان آثار پر ارزش مثل کشمیری ا بہ یادگار گذارد. « بہ طوری ک تاکید شد، سعی و کوشش عرفای بزرگ مانند میر سید علی مدانی، سید جلال الدین، میر محمد علی مدانی، میر شمس الدین عراقی و دیگران بود ک مردم این خط را مورد دایت قرار دادند. باید گفت کہ میر سید علی مدانی نسبت بہ تمام مبلغان دیگر اسلام در کشمیر معروف تر است و او از بزرگتر ین شخصیت ای روحانی این سرزمین بہ شمار می رود.

مردم کشمیر در م زمان ا بہ شخصیت او اعتقاد عظیم داشتند. غفار اف نوش کہ » علی مدانی را ر بزرگ کشمیر می نامند « و این بی سبب نیست، زیرا بہ قول دانشمند ایرانی م دی درخشان او ب کشمیر رفت، » خلقی را مرید خود ساخت «. میر سید علی مدانی چندین بار بہ کشمیر سفر کرد است، بار اول (سال 1372) درع دسلطان ش اب الدین مرا700 نفر خویش و اقربا و مریدان و شاگردان وارد کشمیر شد، در محل علی الدین پور فرود آمد و چ ار ماہ در آنجا اقامت داشت. آن وقت میان سلطان ش اب الدین و سلطان فیروز شا تغلق جنگ عظیمی برپا بود، بنا بر سعی میر سید علی مدانی کہ برای برقرار نمودن صلح در ش ر فیروز

پور با سلطان ش اب الدین ملاقات نمود، کار با صلح انجام یافت وولایت پنجاب تا مرز سرند تحت تصرف ش اب الدین محمد درآمد .

مسافرت دوم میر سید علی مدانی بہ کشمیر (سال 1379) در زمان سلطان قطب الدین صورت گرفت و مدت دو تا پنج سال طول کشید. بار سوم (سال 1384) در این دیارتن ا چند روز توقف نمود است وبس. م سلطان زاد در این خصوص می نویسد : » ب عقید سیمیا ناف میر سید علی مدانی شیش سال و ب گفت میرزا حیدر چ ل روز و ب قول خواج اعظم دیدمری کشمیری سال در کشمیر زندگی کرد است. بہ فکر مارس مؤلف م بہ نا صحیحی را داد اند... از مقایس ومشاد دلیل وسن ای سفر وزندگی میر سید علی مدانی بہ چنین خلاص ای آمدن ممکن است کہ در کشمیر ومضافات ای آن پنج سال اقامت ورزید، «

سید محمد خاوری بہ مناسبت سفر اول میر سید علی مدانی بہ کشمیر ابیات ذیل را سرود است:

میر سید علی شمدان سیر اقلیم سبع کردنکو
شد مشرف زمقدمش کشمیر ال آن ش ررا دایت جو
سال تاریخ مقدم اورا یابی ازمقدم شریف او

میر سید علی مدانی چندین سال حیاتش را در آنجا گذرانید، سلسل مرتب عرفانی را در این سرزمین بہ وجود آورد. وی مبلغان وواعظان متعدد در تعلیم داد، آن ارا ب نقاط گونا گون کشمیر ارسال می کرد، تا مردم را با تعلیمات اسلام شناسایی نمایند. شاگردان میر سید علی مدانی در سرتا سر کشمیر خانقاہ و مدرسات سیس نمودند. چنانچ سعید محمد قریشی درب جار مقیم گشت، آنجا یک مسجد کلان ساخت. سید جمال الدین عطایی در موضع شیر پرگن سکونت نمود، در مانجا تعلیمات اسلامی را رواج داد. حضرت سید کمال در درپنش رکارای تبلیغاتی مشغول گشت. حضرت میر رکن الدین وسعید فخر الدین ب امر میر سید علی مدانی در موضع آونیپور سکونت نمودند.

میر سید علی مدانی در کشمیر کتابخان بزرگ خود رات سیس کرد. میر سید علی مدانی بین سلاطین و بزرگان وسایر افراد این دیار نفوذ مذبی بسیار داشت. حکمران کشمیر، سلطان ش اب الدین و سلطان قطب الدین از مریدان او گشتند . بہ توصی او سلطان ش اب الدین در سرینگر مسجد جامع بنا کرد. سلطان قطب الدین نیز ب رنمایی او عمل می کرد واو امرش را با دل وجان بجا می آورد. او با شنیدن خبر ورود میر سید علی مدانی بہ سرزمین کشمیر با امرای مملکت برای پیشوازش از ش ر بیرون رفت، در محل علی الدینپور منزل شایانی برای اقامت اوت ای نمود. سلطان قطب الدین با اخلاص وآداب محبت وارادت رروز

بہ خدمتش می رفت، از صحبت ایش ب رو رمی گشت وم نصیحت اوتوصی ای اوراب اجرا می آورد. اولباس ندوان کہ تا آن زمان برتن می کرد، کنار گذاشت واز دوخوارک درازدواج وی بوداند، یکی را طلاق داد. بنابرفرمایشات او مدرس او مرکز ای تعلیمی اسلامی در ر دت سیس شد. از آن جمل، اولین مدرس اسلامی بنام » مدرسۃ القران « نیز بنا کراوست کہ درآنجا علوم اسلامی وزبان ای عربی وفارسی درس دادمی شد. در مدرس مذکور شیخ سلیمان ک قبل ندو بودوب ارشادو دایت شامدان ب دین اسلام روآورد بہ آموزش » قرآن « توج ظارنمود بود، بہ تحصیل پرداخت وپس از آن چون یکی ازمفسرین نامور » قران « شناخت شد. در مدارس متعدد دیگری ک درآن زمان درش رو دردم مکشور بنیادگشت، تعلیم زبان فارسی آغاز گردید.

سیدعلی مدانی کلا مبارک خودراب سلطان قطب الدین عطانمود. سلطان آداب قبول آن را ب جا آورد، آن راب سرخودن ادواین عنعن تا آخرسلطنت خانوادشامیریان ادام یافت، تا آن دمی ک باخواش سلطان فتح شا کلاعلی مدانی درکفن او پیچانید شد (1516)، سلاطین شامیری کلا اوراب سر می ن ادند. درظرف دو ونیم سالی کہ میر سیدعلی مدانی در کشمیر اقامت داشت، بین او و برمنان کشمیر مباحث ومناظر برگزارمی شدودر پرتو دایت او برمنان کشمیر گرو، گرو بہ دین اسلام روی می آوردند.

کشمیر راب شرافت دانشمند وعارف نامور میر سیدعلی مدانی وعرفای دیگر چون م دتصوف وعرفان شناخت اند. مدتی در کشمیر زیستن و بہ ارشاد اشتغال داشتن میر سیدعلی مدانی ازقرن چ اردم این خط رام دتربیت و رشد شخصیت ای عرفانی ممتاز گردانید، از بس کہ فضای معنوی کشمیر از فیض ورائح عرفان وحدت الوجودی معطرگشت بود، ناگزیر در آیین شعر متجلی شد. علاوہ برغزل وقصاید عرفانی مثنوی او داستان ای عارفان عرض وجود کردندک » بحر العرفان « اکمل بدخشی، » عین العرفان « عبدالواب نوری، » نورعلی نور « محمد افضل سرخوش، » عدث اللقا « و » کنز العشق « شیخ محمد چشتی رادو » تنبی القلوب « حبی، مثنوی عرفانی در موضوع محلی گفتہ کامل بیگ بدخشی » اکنندن « از جمل آن ایند. شایان یادآوری است کہ وقتی میر سیدعلی مدانی در سال 1372 کشمیر تشریف آورد، شعر فارسی در این دور رواج یافت بود، چون شاعری بہ نام سعید محمد خاوری تاریخ ورود او را منظوم ساخت اما رواج زبان وادبیات فارسی در کشمیر ب آن نیز وابست بود کہ ش اب الدین (1354 ـ 1373)، قطب الدین (1373 ـ 1389) سکندر (1389 ـ 1418) وخصوصا زین العابدین (1420 ـ 1470) ودیگر سلاطین علم دوست و ادب پرورشامیری بہ زبان فارسی توج بی انداز داشتند وبرای گسترش آن در کشمیر سعی فراوانی بہ خرج

دادند. مچنین ال علم و ادب فارسی را کہ از مرکزای اسلامی آن زمان مانندرات، مرو، بغداد، وسمرقند و بخارا روبہ کشمیرن ادند، تقدیر و پذیرایی می نمودند. از تشویق وحمایت سلاطین سخن شناس وادب پرور کشمیر برخوردار شد، گرو نمایندگان علم و ادب از ورارود و اطراف آن جانب کشمیر رسپار شدند و وجود آن ابر زندگی اجتماعی وفرنگی مردم تاثیر عمیق گذاشت.

محض در دور حکمرانی سلطان ش اب الدین زبان فارسی چون زبان رسمی دولتی اعتبار زیاد پیدا کرد. در مدارس دینی در برابر تعلیم مذہبی تدریس زبان فارسی گوا آن بود ک امرا بہ مسال ترویج زبان فارسی امیت بی انداز ظارمی نمایند. راجع بہ این مسال نیز در سرچشم انظرات خویش را دانشمندان و مورخان ارای نمودند. عبدالقادر سروری ع دسلطان قطب الدین را» زمان ارتقای زبان وعلم وادب فارسی در کشمیر« می نامد. بہ مت این سلطان کہ بشعر و ادب علاق وافری داشت و بہ فارسی شعرم می گفت، کتابخان او مدرس وخانقاہ ابر پا گردید. دارالعلومی کہ او تشکیل داد، تا قرن نوزدم تعلیم گاہ اساسی علم و ادب فارسی در این سرزمین بہ شمارمی رفت. در ع دسلطان سکندر مدرس اسلامی تاسیس یافت ک بہ سبب این کہ نزدیک مسجد جامع بودب نام مدرس مسجد جامع مش ورگشت. در آن مدرس میر محمد علی بخاری، ملا محمد یوسف کشمیری، ملا صدرالدین کاشی، مولانا سید حسین منتقی وغیرہ درس می دادند. در آن دور جمال الدین مدوش کہ بمراہ امیر کبیر ب کشمیر آمد بود، مدرس ای بنام» عروۃ الوثقی« ت سیس نمود.

دور حکومت سلطان زین العابدین ک آن را» درخشان ترین دور تاریخ پنج صد سال حکومت اسلامی در کشمیر« نامیداند، یکی از ب ترین دورای ترویج وگسترش زبان واد بیات فارسی در کشمیر ب شمارمی رود. در این دور زبان فارسی بہ حیث زبان رسمی کشمیر مقام کسب کرد. در دوران حکمرانی او علم و ادب در این سرزمین بہ طور عموم پیشرفت قابل ملاحظہ نمود، دانشمندندی سید عبدالل می نویسد کہ سلطان زین العابدین » فیاض ال علم بود واز ارباب علم قدردانی می کرد، در بار ایشان موارگ وار علمای ندو و مسلمان بود و بیشتر با ایشان راجع بہ مطالب علمی بحث ومناظر می کرد«. محب الحسن بہ این معنی نگاشت است کہ سلطان زین العابدین» در رواداری ودلچسپی بہ شعر وادب وقدردانی ال سخن از اکبر و محمد قلی قطب شاہ پیشرو بود«.

این سلطان فرنگ پناو سخن پرور کہ دارای طبع موزون بود، بدات اشعار ناب نیز می سرود، بہ طریق جدی و با شور وحرارت فوق العاد بہ نشر وترویج زبان واد بیات فارسی در این سرزمین توجہ نمود و بی شک، سم او در گسترش زبان فارسی در کشمیر و زبان رسمی شدن آن بزرگ است. انتساب دو اثر منثور فارسی نیز گوای بہ اعتبار او در ترویج زبان فارسی می باشند. دارالعلومی کہ او در نوش رہ (نزدیک سرینگر)

بنیاد نمود، مرکز اشاعت زبان فارسی و عربی در کشمیر گشت، برای پیشرفت این دانشگاه سلطان زین العابدین از ایران وآسیای مرکزی سخنوران و دانشمندان رادعوت کرد. از جمل، مولوی کبیرک به دعوت اوازرات به کشمیر آمد بود، ریاست این دانشگا رابرع دداشت. شیخ اسماعیل کبروی، ملا پارسا، سید حسن منتقی، ملا احمد کشمیری ملا حافظ بغدادی، ملا جمال الدین خوارزمی، میرعلی بخاری، مولانا بصیر، ملا یوسف راشدی و دیگر ال علم و ادب زمان از استادان این دانشگاه بود اند. سلطان زین العابدین برای دانشجو یان کتابخان بزرگی تشکیل داده، بہ مقصد ب دست آوردن نسخ ای خطی کتب دینی و ادبی بہ زبان ای فارسی وعربی و سنسکریت دی؟ ؟ای زیادی به امرای ایران و افغانستان و گجرات و سند میفرستاد. سلطان زین العابدین کب نشر و ترجم آثار گرانب ای سنسکریت به فارسی توجہ خاص ای داشت، » دارالترجم « (متعلق بدارالعلوم) ت سیس کرد. توسط ۱۲ نمایند علم و ادب فارسی وعربی وا نفر عالم سنسکریت کہ اعضای » دارالترجم « بودند، با فرمان سلطان، اثرای برجست مدنیت قدیم ندوا ب زبان فارسی برگردانید شدند. مثل، ملک الشعرای دربار زین العابدین، ملا احمد کشمیری با کمک پندیت احماس بزرگ » م اب ارت « ، داستان تاریخی » راج ترنگنی « کلن، » کتسر یت سا گر، « سامدیوراب فارسی ترجم کرد. شستر او ویدا نیز ب فارسی ترجم شدند.

ازطرف دیگر، آثار فارسی نیز بزبان سنسکریت ترجم می شدند کہ این نکت نیز در ترویج زبان و تفکر فارسی بی ت ثیر نماند، مثلا مورخ مش ور کشمیر شریور » یوسف وزلیخا « عبدالرحمن جامی را بزبان سنسکریت درآورد (1505). جوارلعل ن رواین اقدام سلطان زین العابدین را چون خدمت بزرگ او در ترویج ادبیات فارسی در کشمیر بہ قلم داد است. دراین دور زبان فارسی بین ندوان کشمیر نیز رواج کامل یافت و دراین را سلطان زین العابدین کوشش زیادی به خرج داد. اومی خواست کہ زبان فارسی زبان معاشرت مردم غیر مسلمان نیز باشد کہ در کشمیر سکونت داشتند. یکی از اقدام ای کہ او دراین جاد عملی گرداند، این بود ک او بچ ای پندیت اراک به مدرس داخل می شدند، ب زیر سرپرستی خود گرفت، بہ آن امااان می داد و پس از اتمام تعلیم برای ایشان منصب ای خوب م مقرر می کرد.

لازم به یادآوری است کہ برای ترویج زبان فارسی در کشمیر پندیت ا خدمات شایست ای بہ سامان رسانید اند. نخست پندیت اب تحصیل و آموزش زبان و ادبیات فارسی گام برداشتند. پندیت اا ز زمان قدیم بزبان فارسی آشنای داشتند، حتی تا ع دقطب الدین پندیت ای کم نبودند کب این زبان آزادان حرف می زدند. در زمان سلطان زین العابدین ندوبی بنام یادبت از اولین

مصنفان بزبان فارسی بوداست،. اوہمچنین، » جیین پرکاش « از سنسکریت ب زبان کشمیری ترجم نمود بود. بنا برمعلومات » تاریخ فرشت یادب » شانام فردوسی راازیادمی دانست وآن راباصدای دلپذیرقرت می کردوحتی بزبان ندی ترجم کرداست.

سلطان زین العابدین برای تعلیم علم طب دارالشفانیز بنیادکردک درآن بفارسی تعلیم دادمی شد. طبیب مش ورزمان محمدابن احمدابن یوسف ابن الیاس کرسال طبی اش » کفای مجت دی « درتمام ندوستان اشت ارداشت، دراین مدرس مشغول تدریس بود. نظرداشت ب این اعمال ودیگر کارایی ک سلاطین شامیری دربنیادمساجد ومدارس کرداند، امکان می ددکہ بگوییم کہ آن ادررواج اسلام و قبول آن درکشمیرودر برابرآن درگسترش زبان فارسی دراین سرزمین س م زیادی داشت اند.

سلطان زین العابدین درع دخودزبان فارسی رازبان رسمی قرارداد. اوبان ایت وسعت قلبی ب تشویق وحمایت شعراوادبای فارسی کوشید. ازاین لحاظ، دردربار اوسخنوران مش ورودانشمندان معروف زمان مانند. ملااحمدکشمیری، مولوی کبیر، ملاپارسا، مولاناقادری، ملاضیایی، ملاندیمی، ملافصیحی، ملاجمیل، ملااحمدرومی، ملامحمدرومی، ملانورالدین، ملاعلی شیرازی، مولاناحسین غزنوی، مولاناسیدمحمدمنتقی، ملاحافظ بغدادی، مولاناجمال الدین، قاضی علی سید، ناصرالدین بی قی ودیگران جمع شد بودند. خواجہ اعظم دیدمری دراین موردنوشت کہ:

» درع دسلطان زین العابدین فضلا وشعرای بسیاردرکشمیر بودند، چ ازمولدولایت وچ ازمتولدان این ش ر. «

دردورہ حکمرانی چک ا(1561 _1589 شعرفارسی درکشمیر بیشتر رونق گرفت. البت پس ازوفات سلطان زین العابدین (1470) سلاطین شامیری برای ترویج وتشویق زبان وعلم وادب فارسی بت سیس مدرس اپرداختند، ولی ناسازگاری ای داخلی فرصت کافی برای این کارباقی نگذاشت. شاان چک درکشمیرتن اسی سال حکمرانی نمودند، ولی دراین مدت کوتاہ براثرتوجہ بی پایان بعضی از حکمرانان شاعر و موزون طبع این سلالہ، امثال حسین شاہ (1561_1570) ، علی شاہ(1570_1579)، ویوسف شاہ(1580_1586)، بہ علم وادب فارسی، قدردانی وسرپرستی آن اازال علم وسخن کہ شعرای بسیاری رادردربارخود پرورش دادند وباکوشش بی اندازشان زبان و ادبیات فارسی وشعروشاعری درکشمیررواج کامل پیدانمود. عبدالقادرسروری باتکی بہ معلومات » تاریخ حسن) ازکسادبازارعلم وفن درکشمیرکہ پس ازوفات سلطان زین العابدین بہ نظرمی رسید، افسوس خورد،

چنین می نویسد :*پس، درع دچکان حسین شاہ چک کہ درسخن گستری طبع عالی داشت و پرورش وقدردانی سخنوران بسیاری را کرد، حرف شعروسخن اندک رواج یافت*.

ازبس کہ شاان چک مذب شیع رادرکشمیررسمیت داد بودند، چندین سخنورودانشمندشیع مذب از ایران وآسیای مرکزی جانب کشمیررخت سفر بستند، ملا نامی، ملام ری، مولانا میرعلی، ملامحمد امین مستغنی، ملا عینی، بابا داوود خاکی، خواج؟ میرم بزاز، خواجہ حسن قاری، خواجہ اسحاق قاری ودیگران از شعرای معروف این دور بہ شمار می روند. مین طور در دور حکومت مستقل مسلمانان کشمیر (قرن ای 14-16) زبان فارسی رواج کامل یافت، نتن ابرای امور مذبی وعلمی واداری ودولتی بہ کار می رفت، بلک درزمین ای مختلف ادب بہ این زبان آثار گرانب ابظ وررسید.

درقرن ای بعدی نفوذ زبان فارسی درکشمیر بازم بیشتر گردید واین با تصرف این قلمرو از جانب تیموریان ندارتباط قوی دارد. دراین دورزبان فارسی درکشمیراز روقت بیشتر رواج یافت ودرتمام رشت ای حیات علم وفرنگ مقام استوار پیدانمود. دررابطہ بامین انکشاف محیط ادبی فارسیان بودک زبان فارسی نیز درکشمیرخیلی ترویج یافت وب اوج اعلای خویش رسید. مین طریق زبان فارسی درکشمیر بہ تاریخ این قلمرورابط قوی داشت، ورودخاندان ای فارسی نژادودولت داری ای فارسی رات ثیرزبان فارسی رونیز بہ این منطق بازنمود. امارکن مم واساسی انتشارزبان فارسی درکشمیررانمایی اسلام دراین منطق می باشدکہ آن اساس بازبان فارسی واز جانب فاضلان فارسی زبان صورت می گرفت.

مآخذ

۱. کشمیرمیں فارسی ادب کی تاریخ. عبدالقادرسروری.

۲. ادبیات فارسی درمیان ندوان. عبدالل سید.

۳. تاریخ اعظمی.

۴. ریاض، محمد فارسی سرایان کشمیردردورپیش ازتیموریان،

19.-Tikku G. L. Persian poetry in kashmir. p 125

۶. تاریخ حسن. ایران صغیر باتذکرشعرای پارسی زبان کشمیر.

☆☆☆

غزلیں Ghazlein

Rafeeq Raaz (Srinagar)
رفیق راز (سرینگر) cell-7889968878

جاری تمام رات یہ جشن طرب رہے
ایسا ہو تا قیام قیامت یہ شب رہے

پانی ہوا درخت زمیں اور یہ آسمان
جو کچھ بھی تو نے خلق کیا ہے وہ سب رہے

گزرے تمام عمر تگ و تاز میں مری
جس کا وجود ہی نہیں اس کی طلب رہے

جلتے ہوائے تیز کے شہپر ہیں اس جگہ
یہ بارگاہ خاک ہے پاس ادب رہے

خوابوں میں ڈھل سکے ہیں نہ منظر ہی بن سکے
نظروں کے سامنے تری ہم بے سبب رہے

سمت سفر ہو کوئی بھی لیکن رفیق راز
منزل مری ہمیشہ دیار عرب رہے

☆☆☆

شیر کی آنکھ ہے یا شعلہ امکاں جاناں
کتنا روشن ہے یہ تاریک بیاباں جاناں

میں سفر میں ہوں ابھی یہ مری منزل ہے کہاں
میرا تو نقش قدم ہے یہ بیاباں جاناں

سیل انوار سے سیراب ہوں اندر سے میں
داغ دل کا ہے مرے مہر درخشاں جاناں

کان ہے روشنیوں کی یہ مری خاموشی
ایسی نعمت سے ہیں محروم سخن داں جاناں

وادیٔ عشق سے جو تیری طرف جاتا ہے
صورت زلف ہے وہ راستہ پیچاں جاناں

تیری خاطر ہی گرا دی ہے یہ دیوار بدن
تیری خاطر ہی کھلا ہے یہ درِ جاں جاناں

اب کے تو ایک جنوں ہے مرے سر پر بھی سوار
اب کے تو میں بھی نہیں بے سروساماں جاناں

☆☆☆

سر کر کے آگئے ہیں بیابان یاس ہم
آئے ہیں جھنڈے گاڑ کے اب اپنے پاس ہم

لہرا کے تیغ خامشی پھیلا چکے بہت
صوت و صدا کے شہر میں خوف و ہراس ہم

آواز اک کرخت سی ہم تھے شکست کی
نازک سماعتوں کو نہیں آئے راس ہم

دیوار دھار لیتی ہے جب آئینے کا روپ
ہوتے ہیں اپنے سامنے ہی بے لباس ہم

اک دن تو یہ بھی ٹوٹے گی مجھ کو یقین ہے
دل میں بچائے رکھے ہیں جو ایک آس ہم

نکلیں گے مثل برق گھٹاؤں کو چیر کر
ہوجائیں گے جنوں میں کبھی بے لباس ہم

☆☆☆

اس چشم پر خمار کو حیرت سرا لکھوں
یا آفتاب اس کو شب تار کا لکھوں

باب جنوں میں اپنی کتاب حیات کے
صحرائے لق و دق کو بس اک نقش پا لکھوں

میری مراد آگ ہے تیرے خیال سے
آتا نہیں سمجھ میں اسے اور کیا لکھوں

فانوس آب میں ہوں وہ شعلہ کہ کچھ نہ پوچھ
کیا کیا ہے اس کی شعلگی کی زد میں کیا لکھوں

عرش عظیم پر ہی فقط گونجتی ہے جو
خاموشی کی مہک کو میں ایسی صدا لکھوں

☆☆☆

سکوت سنگ ہے آواز سے بہتر زمیں پر
لئے سینوں میں کیا اسرار ہیں پتھر زمیں پر

نشاں سجدوں کے روشن مثل انجم تھے کہ جیسے
بچھایا ہو کسی نے آسماں اس سر زمیں پر

رہے گا زلزلہ آ کر وہ جس کا وعدہ بھی ہے
رہیں گے کب تلک استادہ بام و در زمیں پر

یہ کب محسوس کر لینگے زمانے کی حرارت
پگھل جائینگے کب یہ برف کے پیکر زمیں پر

ترے افلاک سے کچھ گہرے گہرے رنگ لے کر
نئے منظر بناتا ہوں تخیل بھر زمیں پر

اڑائے گا کہاں تک خاک مجنوں کی طرح تو
یہ وحشت ایک طاقت ہے بڑا کچھ کر زمیں پر

☆☆☆

کتنا دلکش ہے یہ ساز زنجیر پا
رقص کرتے ہیں سب بین ارض و سما

تو جو بچھڑا تو ہر سو اندھیرا ہوا
تجھ سے روشن مگر حافظہ ہے مرا

خواب ہو تم تو آنے میں کیسی حیا
آنکھ کا یہ دریچہ ہے اب بھی کھلا

مانگتی ہے قبا حرف کی مجھ سے روز
اک بھٹکتی ہوئی آتما سی صدا

رات تھی سامنے اور عقب میں ہوا
دو محاذوں پہ لڑتا رہا یہ دیا

☆☆☆

Sohail Iqbal (Saudi Arabia)
سہیل اقبال (سعودی عرب)
cell-0096-655-471-1667

دل کو تو لگا رہتا ہے کھٹکا تمہارے ساتھ
دنیا نہ دیکھ لے کہیں تنہا تمہارے ساتھ

قطرہ مرا حمایتی ،دریا تمہارے ساتھ
ہوگا مقابلہ بھی غضب کا تمہارے ساتھ

پوچھا تو ہوگا سب نے مجھے دیکھنے کے بعد
وہ کون تھا غریب سا لڑکا تمہارے ساتھ

کیا چل سکوگے دور تلک تم یہ سوچ لو
میں چل رہا ہوں دین پہ، دنیا تمہارے ساتھ

تم ہمسفر بنو تو نہیں اس میں کوئی شک
آئے گا مجھ کو لطف سفر میں تمہارے ساتھ

کہنا پڑا کہ مجھ کو مری عمر کا سفر
مہنگا پڑا ہے جانِ تمنا تمہارے ساتھ

جب راستے میں مجھ کو ملے گا مرا رقیب
منظر وہ ہوگا دیکھنے والا تمہارے ساتھ

آتا نہیں سفر کا مزہ دھوپ میں سہیلؔ
ہوتا جو اس کی زلف کا سایا تمہارے ساتھ

☆☆☆

رات میں دھوپ نکلنے کی دعا مانگتے ہیں
لوگ جو تیرے بدلنے کی دعا مانگتے ہیں

مجھ سے وابستہ ہیں کچھ ان کی امیدیں شاید
جو مرے پھولنے پھلنے کی دعا مانگتے ہیں

پہلے تو مجھ کو پلاتے ہیں شرابوں پہ شراب
اور پھر میرے سنبھلنے کی دعا مانگتے ہیں

اپنی حالت کو بدلنے کی نہیں ہے کوشش
اپنے حالات بدلنے کی دعا مانگتے ہیں

یاد کرتے ہیں تجھے چاند کو تکتے ہوئے ہم
اور اک چاند نکلنے کی دعا مانگتے ہیں

☆☆☆

اک بات سرسری سہی ، پھر بھی ہوئی تو ہے
امید رسم و راہ کسی سے بڑھی تو ہے

بیٹھا ہے پاس مرے چلو حال پوچھ لوں
مانا کہ اجنبی ہے مگر آدمی تو ہے

سب کچھ ہے پاس میرے خدا کا دیا مگر
اس زندگی میں آج بھی تیری کمی تو ہے

محفوظ ہو رہا ہے حسینوں کے درمیان
بوڑھا سہی پر آنکھ میں کچھ روشنی تو ہے

ہاتھوں سے جان بوجھ کے تلوار پھینک دی
اک چال اپنی جنگ میں ہم نے چلی تو ہے

مانا کہ اس میں اتنی بلاغت نہیں سہیلؔ
لیکن ترے کلام میں برجستگی تو ہے

Dr. Rafique Anjum (Rajouri)
cell-7006333074
ڈاکٹر رفیق انجم (راجوری)

زندگی کی خدارا دعائیں نہ دے
جاں بلب ہوں اب اتنی سزائیں نہ دے
تو نے پایا مجھے اور پھر کھو دیا
میں گیا وقت ہوں اب صدائیں نہ دے
ہچکیاں لے رہی ہے شمع آرزو
بجھ نہ جائے کہیں یوں ہوائیں نہ دے
زندگی بھر نہ جن کا تعارف ہوا
جاتے جاتے ہمیں یہ وفائیں نہ دے
ہر کسی پہ گماں تیرا ہونے لگے
میرے محبوب اتنی ادائیں نہ دے
خون سے لکھ نہ اشکوں مُس کچھ بات کر
میری چاہت میں خود کو سزائیں نہ دے
وہ سمجھتا ہے دل کی زباں دوستو
کوئی انجمؔ کو جھوٹی دعائیں نہ دے

☆☆☆

مجھے کیا خبر کوئی کیا جانتا ہے
جو جانے تو بس اک خدا جانتا ہے
زمانہ بھی غافل نہیں داستاں سے
میرے ساتھ جو کچھ ہوا ،جانتا ہے
جو آئے ہے من میں کئے جا رہے ہیں
یہاں کون رسمِ وفا جانتا ہے
تمہیں دوستو اس کا احوال پوچھو
میری بات کا وہ برا جانتا ہے
تمہیں ہی دعاؤں میں مانگا ہے انجمؔ
میں جانوں یا دستِ دعا جانتا ہے

☆☆☆

کوئی بتائے کیا ہوتا ہے
دل میں کچھ کچھ سا ہوتا ہے
ہوتا ہے جب پاس وہ میرے
دل کا حال جدا ہوتا ہے
حد سے آگے بڑھ جائے تو
آخر درد دوا ہوتا ہے
لب پہ نام نہیں جو آتا
دل پہ لکھا ہوا ہوتا ہے
کاش تمہیں احساس ہو انجمؔ
درد محبت کیا ہوتا ہے

☆☆☆

Column "Shohrat Beg ki Diary by Arif Naqvi (Berlin, Germany)

عارف نقوی (برلن، جرمنی) cell-0049-151-7068-1386

شہرت بیگ کی ڈائری (۔گذشتہ سے پیوستہ۔)

ہفتہ وار عوامی دورنئی دہلی میں عارف نقوی کے مستقل طنزیہ سیاسی کالم میں سے ایک ۲۶، جون ۱۹۶۰ء

امریکی صدر آئزن ہاور کی فارموسا اور دیگر ممالک کی یاترا کا انجام

یہ پیوستہ بھی عجیب ہی چیز ہے، ایسا چپکتا ہے جس طرح امریکہ کے ساتھ یو ۲ اور یو ۲ کے ساتھ اس کی دم۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح آج کل امریکہ کے ساتھ فارموسا، جاپان، کوریا، ترکی، ایران اور پاکستان وغیرہ۔ بڑی خصوصیت ہوتی ہے اس دم میں۔ ہنومان جی تو صرف اپنی دم میں پہاڑ ہی کو باندھ کر رہ گئے تھے لیکن امریکہ اپنی دم میں پاکستان، ترکی، ایران، فارموسا، کوریا اور جاپان سبھی کو باندھے پھرتا ہے۔ اس لئے اگر ناٹو، سیٹو اور سنٹو جیسے انگریزی نام ادا کرنے میں اچھو ہونے لگے تو ڈاکٹر لوہیا کی طرح ہندوستانی بولنا چاہئے، یعنی دُمِ قلزم، دم بحر الکاہل وغیرہ۔

خیر صاحب ذکر تو کچھ پیوستہ کا تھا۔ نہ جانے یہ آئزن ہاور کی دم کہاں سے پھاند پڑی۔ ضرور کسی کمیونسٹ کی سازش ہے۔ چاہتا نہ ہوگا کہ امریکہ کی قصیدہ خوانی ہو۔ لیکن جناب میں بھی شہرت بیگ ہوں ذکر امریکہ ضرور ہوگا۔ ائزن ہاور ارادہ بدل سکتے ہیں، مگر میں نہیں بدل سکتا۔

بالم آئے بسو مورے من میں۔ آجا پردیسی۔ ایسے میں کوئی چھم سے جو آجائے تو کیا ہو۔ وغیرہ وغیرہ اور طبلہ کی گت، شہنائی کی آواز، پائل کی جھنکار سے ٹوکیو کی فضا گونج رہی تھی۔ ہر چہار طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی۔ دھڑ دھڑ دھڑ چٹ چٹ چٹاچٹ، سرسر سر۔ انار پھلجھڑیاں، چرخیاں، سات آوازے، چٹپٹیا۔ بجلی، چھچھوندر غرضیکہ عجیب چہل پہل تھی۔ شہر کیا تھا ایک طور کی وادی تھی اور نواب صاحب کی حویلی مجسمہء نور تھی۔

نواب صاحب چلمن کی آڑ سے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ دل میں وصل کی تڑپ تھی لیکن اماں جان سر پر جوتی لئے ہوئے کھڑی تھیں۔ جی چاہا اس وقت سارے بندھن سارے رسم و رواج سارے قید و بند توڑ دیں۔ علم بغاوت بلند کر دیں اور کہیں: ''منی جان میری محبوبہ ہے، متاعی ہے، بیاہتا بنا کر رہوں گا۔'' اور یہ سوچتے سوچتے ایسا معلوم ہوتا جیسے سر پر آسمان سے حوروں نے پھولوں کی بارش شروع کر دی ہو۔ جھرجھری سی آجاتی۔ خوشی سے سینہ پھول جاتا۔ وہ اس وقت واقعی سربلند ہوتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے شاہ کوریا سنگ مین رہی حضور عالی قدر نواب صاحب ترکی سندریس کی بلندی اور اس کا حشر یاد آجاتا۔ سامنے کھڑی اماں جان کے ایک ہاتھ میں جوتی اور دوسری میں جھاڑو الگ نظر آتی اور لذت وصل کا احساس حسرت میں بدل جاتا۔ دل کہتا استقبال کو جاؤں تو مشکل نہ جاؤں تو مشکل۔ اور دور بہت دور کہیں ہواؤں کی سنسناہٹ میں ایک آواز بکھری ہوئی تھی: ''چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا۔''

ڈلہن آ گئی، ڈلہن آ گئی، محلّے کے بچوں نے نعرہ لگایا اور ڈولے کی طرف دوڑ پڑے۔۔ کہاروں نے حویلی سے کچھ فاصلے پر واشنگٹن (منی جان دوئم کا ڈالا رکھ دیا۔ میراثیوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر گیت چھیڑا، شہدوں نے مبارک باشد کی صدائیں لگائیں۔ بھانڈوں نے نقل اتاری۔ ڈومنیوں نے اچھل پھاند کی۔ بڑی بوڑھیوں نے بڑھ کر بلائیں لیں۔ صدقے قربان گئیں۔ جم جم جیو، نت نت جیو، سدا سہاگن رہو پھولو پھلو، شباب بنا رہے۔۔۔۔ دیورانیوں نے چہلیں کیں۔ دیوروں نے دیدے مٹکائے۔ محلے ٹولے والوں نے بانہیں پھیلائیں۔ اور ڈلہن کے استقبال کو دوڑ پڑے۔ نواب صاحب کی ڈلہن پورے محلّے کی ڈلہن جو تھی۔ اٹھلاتی، بل کھاتی، قدم قدم پر جلوے بکھیرتی آئی تھی۔

کسی نے کہا جنت کی حور ہے۔ کسی نے کہا راجہ اندر کے اکھاڑے کی پری ہے۔ کسی نے کہا پاروتی نے نیا روپ دھارن کیا ہے۔ ایک انگریزی داں نے کہا گاڈس آف وینس Goddes of Venice ہے۔ ایک منچلے سے برداشت نہ ہوا۔ پالکی کے پاس آیا۔ گھونگھٹ اٹھا کر دیکھا اور بولا مس یونیورس Miss Universe ہے۔ ہائے مار گئی ظالم۔ یہ کہہ کر زور سے سینے پر ہاتھ مارا اور بانہیں پھیلا دیں۔ اور پھر اسی کے ساتھ سیکڑوں بانہیں ہوا میں پھیل گئیں۔ بوڑھی بانہیں، جوان بانہیں، ننھی ننھی سی بانہیں، سوکھی مریل بے جان بانہیں۔ گداز بانہیں۔

منی جان خوش تھیں کہ اتنے قدردان ملے۔۔ لیکن ساتھ ہی ہول بھی کھا رہی تھیں۔ ایک جان اور اتنی بانہیں۔ ہائے اتنا ڈھیر سا پیار۔ ایک پھول سی جان کے لئے۔ ہائے، اگر سب نے باری

باری گلے لگانا شروع کیا تو؟۔۔۔منی جان کو وحشت ہونے لگی۔ڈولے میں سے جھانک کر دیکھا۔

نواب صاحب چلمن کی آڑ سے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں، دونوں نے ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھا۔نواب صاحب نے اماں جان کی جوتی کی طرف اشارہ کیا۔اور منی جان نے فضا میں پھیلی ہوئی لاکھوں بانہوں کی طرف۔ایک نے اشارہ سے کہا دہلیز سے باہر پیر دھروں تو مشکل۔دوسرے نے کہا ڈولے سے نیچے پیر دھروں تو مشکل۔دو نگاہوں کا اتصال، دو اشارے، دو پیام اور بس۔۔۔اور پھر چشم زدن میں نہ جانے کیا ہو گیا۔دلہن غائب تھی۔ ہر شخص آہیں بھر رہا تھا۔

اماں جان سمجھتی ہیں ان کی جوتی دیکھ کر بھاگ گئی۔ابا جان سمجھتے ہیں ڈنڈا دیکھ کر۔ بھائی بہن عزیز واقارب محلے ٹولے والے حیران ہیں کہ الٰہی دلہن کو زمین کھا گئی یا آسمان؟ دلہن کہاں چلی گئی؟ کوئی کہتا ہے آسمان کے فرشتے اترے تھے۔انہوں نے اغوا کر لیا ہے۔کوئی کہتا ہے ہیبت ناک کالا دیو 'مانس گندھ مانس گندھ' کہتا ہوا اترا تھا وہی اڑا لے گیا۔کسی کا کہنا ہے کہ پیشہ ور طوائف تھی کسی اور آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔ایسی عورتوں کا کیا روز نیا پھانستی ہیں۔

ایک بڑے میاں ہانک لگائے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب ازادخیالی کا نتیجہ ہے۔آج کل کی لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے یہی سب سیکھتی ہیں۔آوارہ ہوگئی ہیں۔ہائے قیامت قریب ہے۔ہائے ضرور کوئی جادو ہے۔آسیب ہے۔پچھل پری تھی۔پچھل پری۔

عین اسی وقت منی جان دوئم (حسن واشنگٹن) راجہ صاحب فارموسا کے محل میں داد عیش دے رہی تھیں۔کہا جاتا ہے کہ ہر مرد کو چار عورتیں رکھنے کی آزادی ہے۔لیکن منی جان کا کہنا ہے کہ میں آزاد امریکہ کی حسینہ ہوں، آزادی پسند ہوں کئی خصم کر سکتی ہوں۔۔کسی سے متاع، کسی سے نکاح، کسی سے منگنی تو کسی کے ساتھ ہنی مون۔پیشہ ور ہوں میرے لئے سب جائز ہے۔''

اور شاید اسی لئے یہ رات منی جان نے راجہ صاحب فارموسا کی حویلی میں بسر کی۔باہر آتش بازی چھوٹتی رہی، جشن چراغاں ہوتا رہا۔کائنات حسن و رنگینی میں نہائی ہوئی تھی۔۔خوشبو، مسرت وشادمانی، اور خوشی کے نشے کی افیم کی گولیاں برس رہی تھیں۔حویلی کے چاروں طرف بیلے، چمیلی، گیندے، گلاب اور جوہی کے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور منی جان اپنے پرانے آشنا کے ساتھ محو خواب تھی۔دوسرے روز دنیا کا عجیب وغریب نکاح ہو گیا۔

راجہ فارموسا کی حویلی سے منی جان نے ایک عدد ٹرنک کال کیا اور بس نکاح ہو گیا۔فون ہی

پر دونوں نے ہوں بھری اور بس۔ نہ قاضی کا جھگڑا نہ چھوارے، نقل اور شکر کا۔ صرف ایک ٹرنک کال اور بس۔

یہ شادی بھی کس قدر دلچسپ شے ہے چاہے فون پر کریئے چاہے تار پر یا وائرلیس پر یا خالی ایک پوسٹ کارڈ ڈلوا دیجئیے۔ صرف نمبر ملانے کی دیر ہے فون پر ہی وصل کی لذت حاصل ہو جائے گی۔

سنتے ہیں منی جان نے مہر بہت تھوڑا بندھوایا ہے۔ صرف نواب صاحب کی حویلی اور ان کی جاگیر۔ لیکن اس کے عوض میں دہیز کا بہت سارا سامان لانے کا وعدہ کیا ہے۔ بہت سا ایٹم، ہائیڈروجن سب ہی کچھ تو ہوگا۔

منی جان کا کہنا ہے کہ دہیز میں اتنا سامان لے جاؤں گی کہ ساس کی رال بھی ٹپک پڑے گی۔ فوراً گلے سے لگائیں گی اور بلائیں لیں گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس ٹیلیفونی شادی کے بعد جب فون پر نواب صاحب نے ہنی مون کا مطالبہ کیا تو منی جان بہت ہنسیں، بولیں:

''کہہ تو رہی ہوں راجہ صاحب فارموسا کے محل میں۔''

نواب صاحب جل گئے۔ بولے: لیکن بیوی تو میری ہو؟'' اس کا جواب منی جان کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ بولیں:

''شادی تم سے ہنی مون دوسرے سے۔ اور پھر تم بھی تو اماجان کے غلام ہو۔''

نواب صاحب مچلے: ''نہیں جان من میں تو تمہارا غلام ہوں۔''

منی جان اٹھلائیں: ''تو واشنگٹن میں ملو۔ ہنی مون کے لئے ہالی ووڈ چلیں گے۔'' بہر حال منی جان پھر منی جان ہیں ایک ادا میں سب کو چت کر گئیں۔ سنتے ہیں جب سے اس واقعے کی خبر پھیلی ہے بہت سی مائیں اپنے بانکے سجیلے جوان جہان کلیجے کے ٹکڑوں کو باہر بھیجتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ کبھی گال پر سیاہی لگا دیتی ہیں اور کبھی امام ضامن باندھ دیتی ہیں۔

☆☆☆

ایک سچا خواب

لکھنو یونیورسٹی کے طالب علم: ذکی شیرازی سے ملاقات

ایک بڑے سے میدان میں بہت سی میزیں سجی ہوئی ہیں۔شاید کرکیٹ یا ہاکی کا میچ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔موسم بہت ہی سہانا لگ رہا ہے۔غالباً کراچی کا کوئی خوبصورت اسٹیڈیم ہے۔بادل منڈلا رہے ہیں۔ان کی اوٹ سے سورج کبھی کبھی مسکراتا ہوا اپنا چہرہ دکھاتا ہے اور پھر چلمن کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے۔میرے قریب ہی ہاکی کے بہترین کھلاڑی سمیع اللہ بیٹھے ہیں اور میں موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں کیرم کے کھیل کی اہمیت سمجھا رہا ہوں۔میرے پھوپی زاد بھائی خلیل احمد، ان کی اہلیہ شوکت بھابی، ان کی بیٹی کوثر اور دوسری بہت سی جانی پہچانی شکلیں نظر آ رہی ہیں۔کچھ دوستوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔میں سمیع اللہ سے کہہ رہا ہوں:

''میرا ایک بہت پیارا دوست تھا۔ذکی شیرازی۔۔۔کینسر کا مریض تھا۔۔۔کچھ برس پہلے۔۔۔یہیں کراچی میں۔۔۔''

گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔چند کمسن خوبرو لڑکیاں خوشنما پھڑکتے ہوئے لباسوں میں پھدکتی ہوئی کہیں سے آ گئیں۔

''سر، کچھ چندہ دیجئے گا؟'' انہوں نے سمیع اللہ کو گھیر لیا۔

''کس بات کا؟'' اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''سر، ڈنر میں پیسے بہت لگے ہیں۔''

سمیع اللہ اپنا پرس ٹٹولنے لگا۔''برے پھنسے''۔میں نے سوچا۔ ''اب سو دو سو تو دینا ہی پڑیں گے۔''

''سر ساڑھے چار مارک دے دیجئے۔''

صرف ساڑھے چار مارک؟ اور وہ بھی مارک، روپئے نہیں؟ مجھے عجیب سا لگا۔ لڑکیوں نے مجھ سے کچھ نہیں مانگا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔لکھنو والے ویسے بھی اپنی چرب زبانی کے لئے مشہور ہیں۔اگر کوئی صحیح بات کہتے ہیں تو وہ بھی گھما پھرا کر۔لوگ سمجھتے ہیں کہ ہانک رہے ہیں۔

''کراچی میں میرے بہت سے دوست احباب ہیں ۔ یہاں میرا ایک بہت ہی پیارا دوست ذکی شیرازی تھا۔ بہت حسین، ہنس مکھ، خوش مزاج، نیک، زندہ دل۔ جس محفل میں پہنچ جاتا جگمگا اٹھتی ،قہقہہ زار بن جاتی، جس چمن میں چلا جاتا بہار آجاتی۔ ہم دونوں لکھنو یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ نظریاتی طور پر ایک دوسرے سے کچھ مختلف تھے۔ وہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نوجوان ونگ میں سرگرم تھا اور میں یو پی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا لیڈر۔

اس کے مزاج میں شوخی اور والہانہ پن۔ میری فطرت میں جوش اور سنجیدگی۔ وہ لوگوں کو ہنساتا ان میں زندگی کا رس پیدا کرتا اور میں انہیں سنجیدہ بنانے، جوش دلانے اور دوسروں کے دکھ درد کا احساس دلا کر تڑپانے کی کوشش کرتا۔

ذکی ہمارے شعبہء اردو و فارسی کے صدر پروفیسر یوسف حسین موسوی کا چہیتا تھا۔ وہ اس کی شوخیوں سے نالاں رہنے کے باوجود اس کی لچھے دار باتوں کو پسند کرتے تھے اور مجھے ڈاکٹر احتشام حسین کی شفقت حاصل تھی۔ جو میرے ترقی پسند خیالات کی قدر کرتے تھے۔ موسوی صاحب کی ناراضگی کی سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ جب لاہور سے ڈاکٹر عبادت بریلوی، جو احتشام صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے، تشریف لائے، تو میں نے اردو فارسی سوسائٹی (بزم ادب) کا جلسہ موسوی صاحب کے پیریڈ میں ہی رکھا، جو ہمیں فارسی پڑھاتے تھے۔ تب سے وہ شاکی تھے کہ عارف لکھتا پڑھتا کم اور جلسے زیادہ کرتا ہے۔ ان کی شکایت کچھ حد تک بجا بھی تھی۔ میں ڈاکٹر احتشام حسین، ڈاکٹر خلیل خان، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی وغیرہ کے کلاسوں میں زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ ان میں کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا یا کوئی جلسہ نہیں کرتا تھا۔ بس موسوی صاحب ہی کے پیریڈ میں بزم ادب کے جلسے کرتا۔ مگر جب امتحانات کے دن قریب آتے تو فارسی اشعار کے مطلب پوچھنے کے لئے ان کے گھر پہنچ جاتا اور وہ خوش ہو کر گھنٹوں ہمیں ان کے مطلب سمجھاتے۔ مثلاً عمر خیام کی اس رباعی کے مطلب انہوں نے اس خوبی سے سمجھائے کہ وہ آج تک دل پر نقش ہیں:

ایں کوزہ چو من عاشق زاری بودہ است — در بند سر زلف نگاری بودہ است
این دستہ کہ برگردن اومی بینی — دستی است کہ برگردن یاری بودست

موسوی صاحب جانتے تھے کہ ذکی اور احراز شعبے میں میرے خاص دوستوں میں ہیں۔ اس لئے وہ میری شکایتیں انہیں سے کرتے تھے۔ جو مزے لے لے کر سنتے اور بعد میں مجھے سناتے تھے اور ہم سب مل کے لطف اندوز ہوتے تھے۔ چنانچہ سال کے اختتام پر جب ہمارے شعبے کے

اساتذہ اور طلباء کو ٹائٹل دے کر دیوار پر چسپاں کئے گئے تو موسوی صاحب کے لئے درج تھا:

''اس دور میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے۔''

یونیورسٹی میں میرے دوستوں کے کئی گروپ تھے۔ادب میں دلچسپی رکھنے والے اور شعر و شاعری کرنے والے، مشاعرے اور نشستیں کروانے والے،، ڈرامے میں حصہ لینے والے، یونین کی سرگرمیوں کے کرتا دھرتا اور کئی دیگر سرگرمیوں میں حصہ لینے والے۔ یوں سمجھئے سر پھروں کی کمی نہیں تھی۔شارب ردولوی، جن کا اصلی نام سید مسیب عباس کسی کو یاد نہیں رہا تھا، لڑکیوں میں شارب بھائی بن کر رہ گئے تھے۔ذکی جس کی چلبلی حرکتوں سے کلاس میں جان آجاتی تھی۔اور احراز نقوی جس کے دلچسپ فقروں سے ہم لطف اندوز ہوتے تھے۔نیز اشہد، شاہد اور بہت سے دیگر دوست۔

یونیورسٹی کی کوئی ادبی و ثقافتی تقریب ایسی نہیں تھی جس میں ہم لوگ پیش پیش نہ رہے ہوں۔شاعری کا بھی ہمیں چسکا لگ گیا تھا۔ایک دوسرے کو چائے پلا پلا کر اپنے اشعار سناتے تھے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتے تھے جب تک کہ وہ کھل کر تعریف نہ کرنے لگے۔

ان دنوں شارب کی کوششوں سے طلباء کا ایک ہفتہ وار اردو اخبار پاسبان نکالا جا رہا تھا۔ جس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں انہوں نے چھ نام شامل کئے تھے: شارب ردولوی، عارف نقوی، ذکی شیرازی، احراز نقوی، شاہد رضوی، اشہد رضوی۔ پھر جب ہم نے لکھنو میں طلباء کی ایک اردو کانفرنس، نیز کل ہند مشاعرہ اور شب افسانہ کا پروگرام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا، جس کا افتتاح ۳؍دسمبر ۱۹۵۵ء کی رات کو قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں یوپی کے نئے گورنر کے۔ایم۔منشی نے کیا اور مجاز نے اس میں آخری بار اشعار سنائے:

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے　　سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے　　موت آواز دے رہی ہے مجھے

تو اس میں بھی یہ سر پھرے آگے آگے تھے۔البتہ عالیہ عسکری جواب امام بن گئی ہیں نیز عطیہ بانو مرحومہ جو بعد میں عطیہ خان ہوگئیں، نشاط حیدر، صوفیہ فرید وغیرہ لڑکیوں میں اور ابن حسن، حیدر عباس وغیرہ بھی ساتھ آگئے تھے۔عالیہ جنہیں ہم ان کی دوست مزاجی کی وجہ سے ماہر چپک بھی کہتے تھے، لڑکیوں کی پوری ایک فوج لے کر چندے جمع کرنے میں آگے آگے رہتی تھیں۔ہم جب کسی سے چندہ لینے جاتے تھے تو وہ بہت سے بہت پانچ یا دس کا نوٹ تھما دیتا تھا۔لیکن عالیہ اسے تب تک نہیں چھوڑتیں جب تک وہ چالیس یا پچاس روپئے نہ دیدے۔ایک بار شارب یوپی کے وزیر اعلی

کے پاس چندہ مانگنے کے لئے گئے تو انہوں نے دس روپئے کا نوٹ پکڑا دیا تھا جبکہ اسی دن عالیہ ایک راجہ صاحب سے پچاس روپئے کا چندہ ہماری کانفرنس کے لئے لے کر لوٹی تھیں۔

پھر ایک شام جب امین آباد کے نوری ہوٹل میں کباب کھاتے ہوئے طیب نعمانی (حفیظ نعمانی) نے ایک روزنامہ تحریک کے نام سے جاری کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور شارب سے مدیر کی حیثیت سے کام کرنے اور ہم لوگوں سے تعاون کے لئے کہا تو شارب کے ساتھ عارف، ذکی، احراز حیدر اور ابن حسن اس کے ایڈیٹوریل کاموں میں پیش پیش رہنے لگے۔ حالانکہ ہمیں اخبار نکالنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا نا ہی کاغذ، کتابت اور طباعت کے لئے پیسے تھے۔ صرف حفیظ کے بڑے بھائی کا تنویر پریس تھا اور ہم لوگوں کا جوش اور محنت۔

جس کے بل پر تین مہینوں تک اخبار شان سے نکلتا رہا۔ مگر جب کامیابی نصیب ہوئی تو وہ بند ہو گیا۔ ہماری دوستی کو غالباً جس بات نے پائدار بنایا تھا وہ یہ احساس تھا کہ سماج سے ناانصافی کو ختم کیا جائے۔ اور کیونکہ اس زمانہ میں یوپی میں اردو کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی تھیں اس وجہ سے اردو کے لئے جدوجہد نے ہمیں اور قریب کر دیا تھا۔ ہاں اس بیچ شمیم نکہت بھی کرامت حسین گرلس کالج سے لکھنو یونیورسٹی میں آ گئی تھیں اور ہمیں ملک بار میں شیک پلا کر ہماری صفوں کو مضبوط کر رہی تھیں اور احراز کے چٹکلوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ اور چندے جمع کرنے میں مدد دیتی تھیں۔

۱۹۵۹ء میں ایم اے کرنے کے بعد ہم لوگ ایک طرح سے بکھر گئے۔ ذکی ہماری ایک کلاس فیلو سے شادی کر کے ہمیں بتائے بغیر کراچی چلے گئے۔ احراز بھی لاہور جا کر وہاں یونیورسٹی میں پڑھانے لگے اور ریڈر بن گئے۔ آغا سہیل پہلے ہی لاہور جا کر ایف سی کالج میں شعبہء اردو کے صدر ہو گئے تھے۔ نشاط حیدر، صوفیہ فرید، صہبا فرید، شادیاں کر کے پاکستان چلی گئیں۔ شارب ردولوی انیس کے مرثیوں پر اور شمیم نکہت پریم چند پر لکھنو یونیورسٹی میں ریسرچ کرنے لگیں۔ آغا سہیل کے جانے کے بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین لکھنو کا جنرل سکریٹری بنا دیا گیا، حالانکہ یوپی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی جنرل سکریٹری شپ کی ذمے داری بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ اور اسٹیج و ریڈیو ڈراموں میں وقت صرف کر رہا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں ہی میں ایم اے کرنے کے بعد ریسرچ شروع کرنے ہی جا رہا تھا کہ دہلی سے بلاوا آ گیا اور سید سجاد ظہیر (بنے بھائی) کی قیادت میں آصف علی روڈ نئی دہلی سے اردو کا ترقی پسند ہفتہ وار عوامی دور نکالنے لگا۔ پھر ۱۹۶۰ء میں دہلی اسٹیٹ پروگریسیو رائٹرس ایسوسی ایشن قائم کی جس کا مجھے جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

ایک دن میں رات کو دیر تک کام کرنے کی وجہ سے اپنے ایڈیٹوریل روم میں ہی ایک بنچ پر سو گیا۔ اچانک صبح تڑکے شارب ردولوی وہاں پہنچ گئے۔ ''میرا انٹرویو ہے۔ دیال سنگھ کالج میں۔ اردو لکچرر کی پوسٹ ہے۔'' انہوں نے بتایا۔

ہم لوگوں نے نیچے جا کر ایک ریستوراں میں اڈلی دوشے سے ناشتہ کیا اور دیال سنگھ کالج پہنچ گئے۔ شارب مجھے کوری ڈور میں چھوڑ کر پرنسپل کے کمرے میں چلے گئے۔ میں کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔ ''اس قسم کی نوکریوں کے اعلان تو رسمی طور سے کر دئے جاتے ہیں۔ فیصلے تو پہلے ہی ہو چکے ہوتے ہیں۔'' میں نے سوچا۔

''بھلا لکھنو کے ایک نوجوان کو دلی کے کسی کالج میں کون گھاس ڈالے گا۔'' شارب نے پرنسپل کے کمرے سے نکلتے ہی مجھے اپنے بازوؤں میں کس کر بھینچ لیا۔ میری نیند غائب ہوگئی۔

''یار کمال ہوگیا۔ میرا appointment ہوگیا ہے۔'' وہ خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

شارب دلی آنے کے بعد ہمارے اخبار عوامی دور اور ترقی پسند تحریک سے بھی تعاون کرنے لگے۔ ایک دن جب ہم آصف علی روڈ پر رام لیلا میدان کے پارک میں بیٹھے تھے، میں نے ڈی پی وشست اور شارب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ایک رسالہ رنگ و بو کے نام سے نکالا جائے۔ مجھے اس کا چیف ایڈیٹر اور شارب اور وشست کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ مگر میں زیادہ دن دلی میں قیام نہ کر سکا۔ میرا جرمنی سے اسکالرشپ کا دعوت نامہ آ گیا تھا اور پاسپورٹ بھی مل گیا تھا۔ میں ۲۴ نومبر ۱۹۶۱ء کو برلن کے لئے روانہ ہوگیا۔ پالم ایر پورٹ جانے والی بس میں بنے بھائی (سجاد ظہیر)، شارب ردولوی، ڈی پی وشست اور ڈرامہ نگار ستیو مجھے الوداع کہنے کے لئے ساتھ تھے۔ بعد میں شارب اور وشست نے رنگ و بو کا ایک شمارہ شائع کر ہی لیا۔ لیکن پھر ان کی مستقل مزاجی نے جواب دے دیا۔ یا ان کی دلچسپیوں کا رخ بدل گیا۔

جرمنی آنے کے بعد میں یہاں کے روز و شب میں پھنس گیا۔ کبھی کبھی جب جب فرصت اور تنہائی کے لمحات ستانے لگتے تو اپنے البم میں ڈوب جاتا اور ذکی شیرازی اور لکھنو یونیورسٹی کے دوسرے دوستوں کو یاد کیا کرتا۔ اس بیچ شمیم نکہت بھی مسز شارب عباس بن گئیں ذکی اور احراز وغیرہ بھی بال بچوں والے ہو گئے۔ میں بھی ازدواجی زندگی اور روزگار میں مصروف ہوگیا۔ اگر کبھی ہندوستان آنا ہوتا اور شارب کے گھر پر دہلی کے ماڈل ٹاؤن میں قیام کرتا تو ہم لوگ رات گئے تک دوستوں کو یاد کرتے رہتے۔ خصوصاً ذکی کی شرارتوں اور احراز کی چٹکلی باتوں کو۔ مثلاً ایک واقعہ ہمیں

خاص طور سے یاد آتا۔

ذکی شیرازی، احراز نقوی اور دونوں بھائی اشہد و شاہد رضوی سفید بارہ دری کے قریب محمود آباد ہاؤس کی پہلی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے۔ قریب ہی احمد علی نام کے ایک شخص کا چھوٹا سا ڈھابہ نما ریستوراں 'کیفے ڈی پھوس' تھا، وہ رکشے بھی کرایے پر چلواتا تھا۔ ذکی کبھی کبھی تفریحاً اس کا رکشا رات میں چلاتا تھا۔ ایک دن وہ اس کے رکشا کو چلاتے ہوئے ناولٹی سنیما کے سامنے پہنچ گیا۔ شامت اعمال، بقول ذکی، سنیما چھوٹتے ہی جو صاحبہ وہاں سے نکل کر رکشا کے پاس آئیں وہ وہی تھیں جن کے عشق میں وہ پاگل ہو رہا تھا۔ وہ ہماری کلاس فیلو بھی تھیں۔ ان کو دیکھ کر ذکی وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ اور ہمارے لئے یہ واقعہ عرصے تک مذاق کا موضوع بنا رہا۔

جرمنی آنے کے بعد ایکبار جب میں اپنی اہلیہ اور بیٹی کو لیکر کراچی گیا تو ذکی ہم سے ملنے آیا۔ اس کی وارفتگی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہی خوش مزاجی، وہی شوخی، وہی پھکڑ پن۔ وہ ہمیں میری کلاس فیلو نشاط حیدر اور صوفیہ فرید سے ملانے کے لئے لے گیا۔ یونیورسٹی کے قصے خصوصاً لکھنؤ یونیورسٹی کی مجھ سے متعلق کہانیاں، خصوصاً لڑکیوں کے بارے میں نمک مرچ لگا کر میری بیوی اور بیٹی کو اس طرح سنانے لگا کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کہیں وہ دونوں انہیں سچ نہ سمجھ لیں۔

کچھ عرصے کے بعد ہماری ملاقات لکھنؤ میں ہوئی۔ ہم دونوں اپنے رشتے داروں سے ملنے گئے تھے۔ مجھے یونیورسٹی کے شعبہء اردو میں جرمنی کے بارے میں بولنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ذکی بھی وہاں موجود تھا۔ لیکن اس کی شوخی میں کچھ کمی لگ رہی تھی۔ ہم دونوں نے اپنے پرانے استاد پروفیسر شبیہ الحسن، جو ان دنوں صدر شعبہ تھے، کے ساتھ اور کئی اسکالرس کے ساتھ جن میں انیس اشفاق، شوکت عمر، کیف وغیرہ شریک تھے گروپ فوٹو کھنچوائے اور وعدہ کیا کہ اگلے دن ایک نشست میں ملیں گے۔ مگر ذکی وہاں نہ آیا۔ معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت خراب ہے۔

دوسرے دن میں وزیر گنج میں جہاں وہ اپنی بہن کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا اسے دیکھنے گیا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: ''یار کوئی بات نہیں۔ بس پیٹ میں تھوڑی سی تکلیف ہے۔''

دل نے کہا:

''شاید لوگوں نے مہمانداری زیادہ کر دی ہے۔''

مجھے احراز یاد آ گیا۔ وہ بھی لاہور سے اپنے رشتے داروں اور دوستوں سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اس کی

بھی خاطر تواضع بہت کی گئی تھی۔ مگر واپس جانے کے بعد وہ زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ لکھنو کے کھانے جہاں نہایت لذیذ ہوتے ہیں وہیں اکثر غیر صحتمند بھی۔ مزا بڑھانے کے لئے اکثر ان کا وٹامن مار دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی باہر سے آتا ہے تو اس کی اتنی خاطر تواضع ہوتی ہے کہ انجر پنجر ڈھیلا پڑ جائے۔

میں لکھنو میں زیادہ دن قیام نہ کر سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ذکی ٹھیک ہو کر واپس چلا گیا ہے۔ چند سال بعد جب دلّی گیا اور شارب کے گھر پر ماڈل ہاؤس میں ٹھہرا تو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''ذکی اب نہیں ہے۔''

شارب اور شمیم نے اداس لہجوں میں بتایا۔ اس کا خوبصورت شیرازی چہرہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ اب بھی اکثر اس کی یاد تڑپاتی ہے۔

''وہ میرا بہت پیارا دوست تھا۔ بیچارہ کینسر کا مریض تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔'' میں نے سمیع اللہ سے کہا۔

اچانک میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ دور ایک کونے میں ایک نوجوان سفید شیروانی میں ملبوس بیٹھا تھا۔ خوبرو، ایرانی نقش ونگار، ہونٹوں پر پان کی سرخی۔

ذکی؟

ہو بہو ذکی شیرازی لگتا ہے۔ میں نے سوچا۔ لیکن چہرے پر کچھ پھیکا پن ہے۔ شوخی کی کمی ہے۔ ہونٹوں پر چنچل مسکراہٹ نہیں۔ کچھ سنجیدہ لگ رہا ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے میری طرف بڑھا۔ میں نے بانہیں کھول دیں:

''ذکی؟''

وہ ایک لمحے کے لئے کچھ جھجکا۔ جیسے پہچاننا چاہتا ہو۔

''ارے عارف تم؟۔۔۔ کہاں ٹھہرے ہو؟''

''سوسائٹی میں۔ کزن کے وہاں۔'' میں نے پتہ دے دیا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سمیع اللہ اور دوسرے لوگ بھی اب نظر نہیں آ رہے تھے۔ میدان کے ایک کونے میں چند لوگ میرے بریف کیس کو ٹٹول رہے تھے۔ سیکریٹ سروس کے لوگ لگتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ کچھ کمسن لڑکے ایک طرف کھڑے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

سادے کپڑوں میں ملبوس لوگوں نے میرے سارے کاغذات بیگ سے نکال کر ایک

طرف ڈھیر کر دئے تھے۔ وہ پریشان تھے کہ انہیں کوئی مطلب کی چیز نہیں ملی ہے۔ میں ان سے کہہ رہا تھا:

''ارے بھائی آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ صرف ذاتی کاغذات ہیں۔ مجھے بتایئے، آپ کیا چاہتے ہیں؟''

وہ لوگ کھسیا کر میری طرف دیکھتے اور پھر کاغذات کو بیگ میں واپس رکھنے لگتے۔ مگر نہایت ہی بھونڈے پن سے۔

اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ صبح ہو چکی تھی۔ کھڑکی کے باہر تیز برفباری ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ شاید شیرازی پھر نظر آجائے۔ مگر وہ تو جا چکا تھا۔ اس کی یاد بے چین کر رہی تھی، تڑپا رہی تھی۔۔۔ وہ اتنے برسوں کے بعد کیوں آیا تھا؟ کیا کہنا چاہتا تھا؟ کہیں وہ ہماری کمی تو نہیں محسوس کر رہا ہے۔

اس خواب کو میں نے اسی دن کاغذ پر اتار لیا تھا۔ اور فائل میں محفوظ کر لیا تھا۔ کچھ دن ہوئے کہ مجھے وہاٹس اپ پر ایک پیغام ملا:

''میں ذکی شیرازی ہوں۔ راشد اشرف نے مجھے آپ کا فون نمبر دیا ہے۔ ذکی شیرازی میرے دادا تھے، جو لکھنو یونیورسٹی میں آپ کے دوست تھے۔ میں نے آپ کا ایک پرانا فوٹو اپنے دادا کے ساتھ دیکھا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے پاس کوئی اور تصویر ہے یا آپ کی کوئی اس وقت کی خاص یادداشت ہے، جو مجھ سے شیئر کر سکیں۔ میری دادی فاطمہ شیرازی ہیں۔ وہ بھی لکھنو یونیورسٹی میں تھیں۔ اب وہ پاکستان واپس چلی گئی ہیں اور بخیر و خوبی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو جانتی ہیں اور بات کرنا چاہیں گی۔''

مجھے ایسا لگا جیسے میرا دوست ذکی شیرازی خود لکھنو یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی کی بالکونی میں کھڑا ہے۔

کچھ کہہ رہا ہے۔

افسانے Afsane

Ye Sach Hai by Prof. Shahina Rizvi (Varanasi) cell-9307380555

پروفیسر شاہینہ رضوی (وارانسی)

یہ سچ ہے

یہ گفتگو فون پر ہی ہو رہی ہے۔ایک لڑکی نے ایک بدتمیز لڑکے کی بیچ چوراہے پر پٹائی کر دی۔لڑکے نے اس پر حملہ کیا تھا۔ پٹنے کے بعد بھی وہ حملے کی کوشش کرتا رہا۔ پولیس بھی آئی۔لڑکے کو مارا بھی لیکن ساتھ میں ایک بات تھانے کے ایک داروغہ نے کہی۔

"لڑکیاں بھی تو اپنے آپ کو دکھاتی پھرتی ہیں۔"

یہ ایک سچا واقعہ ہے۔لڑکی نے گھر میں یہ بات اپنی ماں سے بتائی۔اس خاتون کی گفتگو اس داروغہ سے یوں ہوئی۔

خاتون۔: ہلو! آپ داروغہ جی ہیں۔

داروغہ۔: ہاں!

خاتون۔: آج آپ کے علاقے میں ایک لڑکے نے ایک لڑکی کے ساتھ بدتمیزی کی اور جان لیوا حملہ بھی کیا۔؟

داروغہ۔: یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟

خاتون۔: میں اس لڑکی کی ماں ہوں۔

داروغہ۔: ہاں ہاں دیکھئے ہم لوگ بھی پریوارک لوگ ہیں۔لڑکے کی کافی پٹائی ہوئی۔لیکن کیا ہے کہ لڑکیاں آج کل اپنے کو لڑکیاں نہیں سمجھتیں۔

خاتون۔: جی اس سے آپ سے کیا مطلب ہے کہ لڑکیاں آج کل اپنے کو لڑکیاں نہیں سمجھتیں؟ تو پھر کیا سمجھتی ہیں۔؟

داروغہ۔: اب دیکھئے اگر کوئی لڑکا کچھ کرتا ہے تو ذرا ہٹ بچ لینا چاہئے۔مارنے پیٹنے کی ضرورت کیا ہے۔؟

خاتون۔: یعنی اگر لڑکی یا عورت ہے تو اسے ہر لڑکے اور مرد کی بدتمیزی برداشت کرنی چاہئے۔اگر

بدتمیزی پر احتجاج کرے، پھر لڑکی نہیں۔

داروغہ۔: میرا مطلب تھا، نارمل کپڑے پہنے ہوتی تو کوئی بات نہ ہوتی۔

خاتون۔: یعنی وہ جینس اور شرٹ پہنے ہے تو نارمل کپڑے نہیں ہیں۔اور بے چارہ مرد یا لڑکا کیا کرے۔وہ چھیڑ چھاڑ اگر کرتا ہے تو اس کا پیدائشی حق ہے۔اور اگر غلطی سے اپنی ماں یا بہن کو عریاں دیکھ لے تو اس کا حق بنتا ہے کہ اس پر جنسی حملہ کر بیٹھے۔

داروغہ۔: ارے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔بھلا ماں بہن پر ایسا کیوں کرے گا۔ماں تو ماں ہوتی ہے۔

خاتون۔: یعنی مرد کو صرف اتنا دماغ ٹھیک رکھنا چاہئے۔باقی عورتوں کے معاملے میں اسے پورا حق ہے کہ اسے ذلیل کرے۔

داروغہ۔: باقی عورتیں کیوں؟ جو مریادا کے اندر رہیں گی ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوگا۔

خاتون۔: تو کپڑوں کی مریادا کیا ہے؟

داروغہ۔: شلوار کرتا یا ساڑی۔

خاتون۔: ساڑی کیوں؟ ساڑی میں پیٹ اور پیٹھ نہیں دکھائی دیتی؟

داروغہ۔: اسے لڑکے ایسے تھوڑی دیکھیں گے۔

خاتون۔: اور جو آج صبح کے اخبار میں تھا کہ ٹرین کی ایک بوگی میں دو عورتوں کو جو اپنے شوہروں کے ساتھ جا رہی تھیں، انہیں کھینچ کر اندر گھسیٹ لیا گیا اور ان کے شوہروں کو باہر پھینک دیا گیا۔کیا آپ نے یہ انکوائری کر لی ہے کہ وہ دونوں عورتیں بھی جینس اور شرٹ پہنے ہوئے تھیں۔

داروغہ۔: آپ تو بلاوجہ بات کو موڑ رہی ہیں۔پتہ نہیں کیا وجہ ہوئی ہوگی۔

خاتون۔: یقیناً عورتیں قصوروار رہی ہوں گی۔ہوسکتا ہے وہ خوبصورت رہی ہوں گی۔مرد تو کبھی قصوروار نہیں ہوتا۔کب تک آپ اپنی بدکرداری کا دوش عورتوں پر مڑھتے رہیں گے۔

داروغہ۔: دیکھئے آپ بلاوجہ گرم ہو رہی ہیں۔

خاتون۔: اور وہ جو نابالغ چھوٹی چھوٹی بچیوں کے ساتھ بلاتکار ہوتا ہے۔یقیناً ان معصوموں کا قصور ہوتا ہوگا کہ کیوں مردوں کو نظر آجاتی ہیں۔

داروغہ۔: دیکھئے آپ بات کو بگاڑ رہی ہیں۔

خاتون۔: نہیں میں آپ کو صرف سچائیاں بتا رہی ہوں کہ مرد اپنے بیمار دماغ کا علاج نہیں کرنا

چاہتا۔آپ جو مدد بھی کرتے ہیں تو یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ قصور عورت کا ہی ہے۔کیا آپ چوروں کے پکڑنے کے بعد بھی جس کے یہاں چوری ہوئی ہے،اس کو قصوروار ٹھہرائیں گے کہ تم نے مال گھر میں رکھا ہی کیوں؟ دکانوں سے کوئی سامان لوٹے تو آپ یہی کہیں گے کہ سامان سامنے رہے گا تو لوگ لوٹیں گے ہی اور اگر ایسا نہیں ہے تو عورت کے ساتھ غلط ہونے پر عورت کو ہی کیوں قصوروار ٹھہراتے ہیں؟

داروغہ۔: دیکھئے وہ کوئی اچھے گھر کا لڑکا لگ رہا تھا۔اس نے بلا وجہ تو ایسا نہیں کیا ہوگا۔

خاتون۔: وہ بلا وجہ کچھ نہیں کرے گا۔لیکن لڑکی کے ساتھ بلا وجہ ضرور کرے گا، کیوں کہ آپ جیسے لوگ اسے نہیں لڑکی کو قصوروار ٹھہرائیں گے۔اور جناب ایک بات اور یورپ میں جہاں عورتیں اپنا پورا جسم نہیں ڈھکتیں وہاں راہ چلتے تو جنسی حملے نہیں ہوتے۔کیوں؟

داروغہ۔: دیکھئے، وہاں کی بات اور ہے۔

خاتون۔: جی ہاں اور ہے۔وہاں بھی جرم ہے لیکن وہاں جرم کرنے والا مجرم مانا جاتا ہے۔جو شکار ہوتا ہے وہ نہیں۔اور آپ لوگ بھی اب جانوروں کی حدود سے نکل کر تہذیب یافتہ ہو جائیے۔یوں تہذیب کی جھوٹی دہائی دے کر بیجا جواز مت پیش کیجئے۔

اتنا کہہ کر خاتون نے فون کاٹ دیا۔

☆☆☆

Arzoo by Noor Shah (Srinagar) cell-9906771363
نورشاہ (سرینگر)

آرزو

''محبت حشمت دیکھتی ہے اور نہ غربت''

''یہ کتابی باتیں ہیں''

''میں کتابوں کی نہیں اپنی بات کر رہی ہوں''

''کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''میں آپ کی بیوی ہوں۔ شریک سفر ہوں۔ آٹھ سال سے آپ کے ساتھ اسی گھر میں رہ رہی ہوں اور بخوبی جانتی ہوں کہ آپ کی خدمت اور آپ کی دکھ بھال کرنا، آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اور آپ کی چھوٹی بڑی ضرورتوں کو جانب توجہ دینا میرا فرض ہے۔ اخلاقی اور مذہبی فرض ایک سماجی پابندی ہے میرے لئے۔ میں یہ فرض، یہ ذمہ داری بڑی صدقِ دلی سے نبھاتی آرہی ہوں اور کوشش کرتی آرہی ہوں کہ آپ کی زندگی کے سفر کا ہر ہر قدم محبتوں کی خوشبو سے لبریز ہو۔ میں نے اس گھر اور گھر گرہستی کو خلوص دل سے سنبھال کر رکھا ہے، وہ اس لئے بھی کہ یہ آپ کا گھر ہے، میرا گھر ہے۔ ہم دونوں کا بسیرا ہے اور سب سے بڑی بات یہ.....؟''

''بڑی بات کیا.....؟''

''میں آپ..... آپ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ اس قدر محبت کہ اس کی گہرائی، اس کی شدت کا احساس شاید آپ کو نہیں ہے۔ لیکن مجھے دکھ بھی ہے''

''دکھ کس بات کا.....؟''

''ان آٹھ برسوں میں، میں آپ کے یہ اثاثے، یہ زمین و زراعت، یہ جائیدادیں سنبھالنے کے لئے وارث نہ دے سکی۔ وہ مسکراہٹیں نہ دے سکی جو معصوم بچوں کے ہونٹوں پر کھلتی ہیں۔ نہ تو آپ نے گڑے گڑیوں کے کھیل دیکھے اور نہ ہی مٹی کے گھروندے، پر اس میں میرا کیا قصور۔ اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکانا بھی ایک عبادت ہے۔ شاید میری عبادت قبول نہیں ہوئی۔ اسی لئے تو میں نے کئی بار کہا تھا''

''کیا کہا تھا.....؟''

شاید آپ کو وارث مل جائے۔ آنے والے دنوں کے لئے سہارا مل جائے.....!''

''کیسے.....!!''

''دوسری شادی کر کے۔ لیکن آپ تو ہر بار انکار کرتے رہے اور اب.....''

''اب کیا.....؟''

''آپ دوسری شادی کرنے کے لئے بضد ہیں''

''ہاں آرزو میری خواہش کی تکمیل کے لئے میرا ساتھ دینا چاہتی ہے''

''آرزو''

''اُس کا نام آرزو ہے۔ اُس کی ایک شرط بھی ہے''

''وہ کیا.....؟''

''وہ نہیں چاہتی کہ تم بھی اسی گھر میں رہو''

''میں..... میں کہاں جاؤں گی..... میرا کون ہے اب یہاں اس جہاں میں آپ کے بغیر..... آپ بے شک شادی کر لیجئے، دوسری شادی..... آرزو کو ہی اپنا لیجئے۔ لیکن مجھے میرے ہی گھر سے بے گھر مت کیجئے۔ میں اسی گھر میں پڑی رہوں گی ایک گوشے میں۔ آپ کی خدمت کرتی رہوں گی، زندگی کی آخری سانس تک۔ آرزو کو گھر گرہستی سنبھالنے میں مدد کروں گی۔''

''لیکن یہ آرزو کو منظور نہیں''

''اور آپ کو.....!''

''میں مجبور ہوں اور مجبوراً مجھے.....!''

''آپ کو کیا.....؟''

''کوئی راستہ اختیار کرنا ہوگا''

''کیسا راستہ اور کس لئے''

''تم کو اس گھر..... گھر گرہستی اور آرزو سے دور رکھنے کے لئے''

''میں نے آرزو کا ایسا کیا بگاڑا ہے۔ اگر آرزو میری جگہ ہوتی تو کیا وہ ایسا ہی کرتی''

''میں نہیں جانتا''

''آپ نے پوچھا نہیں آرزو سے.....؟''

''نہیں''

''تو آپ جانتے ہی کیا ہیں؟''

''صرف یہ کہ آرزو اس گھر میں آئے گی اور تم کو اس گھر سے جانا ہوگا..... ہمیشہ کے لئے''

''گہری اُداسیوں کا لبادہ اوڑھے میں کہاں جاؤں گی..... اور پھر مجھے اپنے ہی گھر سے کسی کے کہنے یا چاہنے سے بے گھر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس گھر کے در و دیواروں نے لمحہ لمحہ میری حفاظت کی ہے۔ مجھے تحفظ دیا ہے۔ یہ تحفظ مجھے کہاں اور کیسے ملے گا۔ یہاں میری آٹھ سالہ ازدواجی زندگی کے ان گنت راز، ان گنت یادیں، کھٹی میٹھی، آدھی ادھوری یادیں میری چاہت کی گواہ ہیں۔ یہ ساری یادیں آپ سے وابستہ ہیں، آپ کے گھر سے وابستہ ہیں۔ میری محبت ان یادوں کی مرہونِ منت ہیں۔ اب آپ ہی بتائیے مجھے کیسے گھر سے بے گھر کیا جا سکتا ہے''

''طلاق دے کر''

''طلاق.....؟''

''ہاں طلاق''

''اور اگر میں طلاق لینے سے انکار کر دوں تو.....؟''

''سہ طلاق..... آرزو کو پانے کے لئے میں اس حد تک بھی جا سکتا ہوں۔ کیونکہ میں وقت کے بہتے دریا میں ڈوب چکا ہوں۔ اپنے آپ، اپنے وجود اور اپنے آس پاس سے بے خبر ہو چکا ہوں''

''آپ اب بھی وقت کو تھام سکتے ہیں''

''کیسے.....؟''

''کسی بے سہارا معصوم بچے کو گود لے کر..... ایسا کر کے ایک بے سہارا کو سہارا مل سکتا ہے اور آپ کی وراثت کو وارث..... میں وعدہ کرتی ہوں کہ اُس وارث کو میں سنبھال لوں گی، سنوار لوں گی، دیکھ بھال کروں گی، اپنے خون جگر سے پالوں گی، پڑھاؤں گی، لکھاؤں کی، ماں بن کر آپ کا بیٹا کہلانے کے قابل بناؤں گی''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ایسا کر کے میں آرزو کو اپنی آرزو میں کیسے بدل سکتا ہوں۔ ایسا ممکن نہیں ہے میرے لئے اور پھر.....!''

''پھر کیا.....؟''

''طلاق دینے سے روک کون سکتا ہے.....؟''

''میں''

''تم بھی نہیں..... تم سن رہی ہونا۔ میں سنجیدہ ہوں بہت سنجیدہ ہوں..... یہ کیا..... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میری بات سن کر تمہیں مایوس ہونا چاہے تھا لیکن تم.....؟''

''میں کیا.....؟''

''تم ہنس رہی ہو''

''ہاں میں ہنس رہی ہوں۔ لیکن ابھی میری یہ ہنسی بے آواز ہے، بے عنوان ہے، دُعا کیجئے کہ یہ ہنسی بے آواز ہی رہے، بے عنوان ہی رہے، ورنہ.....!''

''ورنہ کیا.....؟''

''ناصر صاحب معصوم بننے کی کوشش مت کیجئے۔ آپ شاید نہیں جانتے، یا جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ مت بھولئے کہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو.....!''

''مجھے کیا..... تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

''وقت نے زبردست کروٹ بدلی ہے۔ اب ایسا کرنے کے لئے آپ کو تین سال جیل میں گزارنے ہوں گے..... اکیلے..... تنہا..... کوئی آرزو نہ ہوگی وہاں اور پھر ان تین سالوں کے دوران بہت سارے دیکھے اَن دیکھے خواب آپ کے لئے صرف ایک آرزو بن کر رہ جائیں گے۔ بہت سارے خواب جاگنے سے پہلے ہی ٹوٹ جائیں گے۔ آرزو کے پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائیں گے..... یوں میری جانب کیا دیکھے جا رہے ہیں۔ میں سنجیدہ ہوں بہت سنجیدہ۔ اور شاید یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ آٹھ برس قبل میں آپ کی زندگی میں آرزو بن کر آ چکی ہوں..... میں ..... جا رہی ہوں''

''کہاں جا رہی ہو.....؟''

''گھر سے باہر نہیں جا رہی ہوں۔ آپ کی نظروں سے بھی دور نہیں جا رہی ہوں اور کبھی بھی نہ جاؤں گی۔ ہمیشہ یہیں رہوں گی..... اپنے گھر میں..... آپ کے ساتھ..... ہاں ذرا چائے بنانے جا رہی ہوں، اپنے لئے اور آپ کے لئے''

''آرزو.....''

''میرا نام آرزو نہیں، جنت ہے اور جنت اپنانے کی آرزو کسے نہیں ہوتی.....!!''

☆☆☆

Panch by Vehshi Syed (Srinagar) cell-9419012800
وحشی سعید (سرینگر)

پانچ

اندھیرا پھیل گیا تھا، لال چوک کی دوکانیں بند ہو رہی تھیں، میں اپنی دھن میں گم گھر کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں کئی حسین لڑکیاں اپنے والدین اور دیگر رشتہ داروں کے ہمراہ اپنے اپنے مقام کی طرف روانہ تھیں۔ خوبصورت اور مدہوش کر دینے والی لڑکیاں، جوانی کے خون کو گرما دینے والی لڑکیاں۔ مجھے اپنے دوست سلطان کا جملہ یاد آ گیا۔

''یار گوپال تم پہلوانی والا دلکش بدن رکھتے ہو لیکن سچ بتاؤں، تمہارا جینا تب تک بیکار ہے، جب تک تمہاری اس بائیس سالہ زندگی میں کوئی حسین پری نہیں آ جاتی۔''

''اب زبردستی پری کہاں سے لاؤں یار، کوئی دل کو بھا جانے والی ایسی لڑکی ہو جو دو باتیں کرے، جبھی تو میں اس سے پیار کا اظہار کروں۔ یہاں تو پہلوانی کے علاوہ کبھی کسی لڑکی سے دو باتیں کرنے کا موقعہ ہی نصیب نہیں ہوا۔''

''ارے بیوقوف موقعہ ملتا نہیں، نکالا جاتا ہے''

''یار موقعہ نکالنے کا موقعہ بھی اب تک نصیب نہیں ہوا۔''

دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز نے میرے خیالوں کو منتشر کر دیا۔ اس سے پہلے کی میں کچھ سمجھ پاتا ، ایک خوبصورت لڑکی پیچھے سے مجھ سے ٹکرائی اور میرے بازوؤں کو تھامتے ہوئے مرے پیروں پر گر پڑی۔

''مجھے اس سے بچایئے۔ وہ مجھ پر جھوٹا الزام۔۔۔ یہ کہ کر وہ زاروقطار رونے لگی۔''

اس کے پیچھے ہی ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور مجھے دیکھ کر رک گیا۔ مجھے لگا کہ کوئی فلم کا سین ہے جس میں ہیروئن ولن سے بچنے کے لئے ہیرو سے مدد مانگ رہی ہے۔ اس آدمی نے مجھے ایک گہری نظر سے دیکھا اور پہچانتے ہوئے بولا۔''ارے جناب آپ۔''

مجھے یاد آیا کہ دس دن قبل میں نے اسے دنگل میں ہرایا تھا۔''کیا بات ہے۔''

''یہ عورت میری دوکان سے سونے کی بالی چرا کر بھاگی ہے۔ کئی سارے زیور دیکھنے کے بعد جب

کاؤنٹر پر زیور اکٹھا ہو گئے، اس نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کان کی بالی اپنے پرس میں ڈال لی۔''

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں عورت نہیں لڑکی ہوں۔'' آخر کے لفظ اس نے قدر خفگی سے ادا کئے۔

''جناب اگر یہ سچ بولتی ہے تو اس کے پرس کی تلاشی لے لیجئے۔ اگر اس میں سے بالی نہیں نکلی تو میں چلا جاؤں گا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم خود بھی شیور نہیں ہو کہ اس نے بالی چرائی کہ نہیں۔ کسی شریف لڑکی کے پرس کی تلاشی صرف شک کی بنیاد پر لینا اس کی کتنی بڑی بے عزتی ہے جانتے ہو۔ اگر بالی ان کے پرس سے نکل گئی تو میں خود انہیں تمہارے ساتھ چل کر پولیس کے حوالے کر دوں گا، لیکن اگر نہیں نکلی تو؟ کیا تم نے بالی اپنے کاؤنٹر کے نیچے ڈھونڈی؟ ممکن ہے وہ زیورات کے ڈھیر میں نیچے گر گئی ہو۔ کیا تم نے اسے کاؤنٹر کے نیچے فرش پر غور سے دیکھا؟'' میرا دماغ کسی جاسوس کے دماغ کی طرح کام کر رہا تھا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ ''لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، اگر ان کے پرس سے بالی نہیں نکلی تو میں تمہیں پہلے تو یہاں بری طرح پیٹوں گا، پھر گھسیٹتے ہوئے پولیس تھانے لے جاؤں گا۔ بولو منظور ہے۔؟

وہ ہکہ بکہ رہ گیا، پھر سر کھجاتے ہوئے بولا۔ ''شائد آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بالی کاؤنٹر کے نیچے ہی گری ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری عزت رکھ لی۔ ورنہ یہ دنیا تو سچائی کو مانتی ہی نہیں۔''

''مانتی ہے، آخر میں نے مانا نہ آپ کی سچائی کو اور مرضی نا مرضی اس نے بھی۔''

''وہ تو اس نے آپ سے ڈر کر مانا۔ اور آپ کی سچائی میں کہیں نہ کہیں نسوانیت سے ہم دردی چھپی تھی۔ اگر میری جگہ کوئی مرد ہوتا تو شائد آپ کا عمل کچھ اور ہوتا۔''

میں اس کی ذہانت پر حیران تھا۔ ''آپ کا مطلب ہے دنیا میں سچائی باقی نہیں ہے۔''

''میرا مطلب ہے، دنیا میں سچ بولنے والے لوگ بہت دنوں تک باقی نہیں رہتے۔ بہر حال آپ نے میری مدد کی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے، اور کیا آپ اتوار کو مجھے کچھ وقت دیں گے تا کہ میں آپ کو ڈل جھیل کے کنارے شام پانچ بجے ایک چائے پلا سکوں۔''

''آپ کا لہجہ بہت بے باک ہے۔''

''مفلسی اور یتیمی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔کیا میں اتوار کو شام پانچ بجے آپ کا شالیمار باغ کے سامنے ڈل جھیل کے کنارے انتظار کروں۔؟''

''لیکن شام پانچ بجے ہی کیوں، چار بجے، یا چھ بجے کیوں نہیں؟''

''کیوں کہ میں سمجھتی ہوں، اس گنتی میں حقیقت پوری طرح موجود رہتی ہے۔تو پھر۔۔۔۔۔۔۔۔''

''میں ضرور آؤں گا۔'' نہ جانے میری زبان سے بے ساختہ کیسے نکل گیا۔اس نے مسکراتے ہوئے الوداعی ہاتھ ہلایا۔میں اس پراسرار لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ'' چلئے، میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔

اتوار آنے تک میں اس لڑکی کی پر اسرار باتوں میں کھویا رہا۔''یتیمی بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔۔۔۔۔۔پانچ کی گنتی۔۔۔۔حقیقت۔۔۔۔۔اتوار کی صبح سے لیکر شام چار بجے کا وقت بڑی مشکل سے گزرا۔ساڑھے چار بجے تک میں شالیمار باغ پہنچ گیا تا کہ دور سے چھپ کر اس کی نقل و حرکت دیکھ سکوں۔پونے پانچ بجے وہ بھی آ گئی اور سامنے ڈل کے کنارے کھڑی ہوگئی لیکن بے چینی سے بار بار گھڑی دیکھے جا رہی تھی۔شائد پانچ بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔''پانچ'' یہ خیال آتے ہی میں پوری طرح تیار ہو گیا اور جب ۳۰ سیکنڈ باقی رہ گئے تو اپنی جگہ سے نکلا اور بالکل پانچ بجے اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھئے ء آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہوئے میں بالکل پانچ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔''

وہ اس ادا سے مسکرائی کے میں نے موقعے کو غنیمت جانا۔ادھر ادھر کی باتیں اور اس کے بارے میں جاننے کے بعد کہ یتیم لڑکی ہے۔بچپن میں والدین کے فوت ہو جانے کے بعد رشتہ داروں کے یہاں پلی بڑھی ہے۔اب ایک سرکاری دفتر میں کلرک ہے، میں نے بھی اپنے بارے میں سب کچھ بتاتے ہوئے اس سے محبت کا اظہار کر دیا اور جلد شادی کرنے کا خیال بھی ظاہر کر دیا۔میں اس موقعے کو گنوانہ نہیں چاہتا تھا۔اس نے سنجیدگی سے میری باتیں سنی اور اگلے اتوار کو اپنا فیصلہ سنانے کے لئے شام پانچ بجے نشاط باغ کا مقام طئے کیا۔اگلے اتوار کو جب ہم ملے تو اس نے میری محبت کو قبول کر لیا۔ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دئے ہم باغ میں بیٹھے تھے۔میں نے تجسس آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

''پچھلے ہفتے تم نے'' پانچ'' کے متعلق کچھ باتیں کی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں زیادہ کچھ سمجھ نہیں

سکا۔''

''پانچ کا میری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جب میں پیدا ہوئی، اس وقت پانچ بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے اور تاریخ بھی پانچ تھی۔ مہینہ بھی سال کا پانچواں ہی تھا۔ میری ولادت سے ٹھیک پانچ منٹ پہلے یعنی ٹھیک پانچ بجے ہمارے گھر میں مسلح چور داخل ہوا اور سب نقدی زیورات سامنے رکھنے کی دھمکی دی۔ میرے والد بہادر آدمی تھے۔ اسے پکڑنا ہی چاہتے تھے کہ اس نے انہیں پانچ گولیاں ماریں۔ پانچویں گولی کی دھماکے دار آواز سے میں اس دنیا پر وجود میں آئی۔ میرے باپ نے اسی وقت دم توڑ دیا۔ ہماری کل نقدی جو پانچ لاکھ تک تھی، رشتہ داروں نے آپس میں بانٹ لیں۔ پانچ ماہ بعد ہی میری ماں بھی اس دنیا سے چلی گئی، وہ بھی پانچ تاریخ تھی۔ اس کے بعد زندگی کے کئی موڑ آئے جس میں اس پانچ تاریخ کی بڑی اہمیت ہے۔ ''پانچ'' گنتی کا کام سچا اور مکمل ہوتا ہے۔ دیکھو، ٹھیک پانچ منٹ میں میں نے اپنی بات ختم کی۔''

پانچ، پانچ کے ورد سے میرا سر چکرا گیا۔ میں نے موضوع کو بدلنے کا ارادہ کیا۔ اسی وقت ہمارے پاس سے ایک انگریز گزرا، جس کے ہاتھ سے ایک کتاب گری، اس کے سرورق پر ایک آدمی پسٹل لئے کھڑا ہوا بنا تھا۔ میں نے اس انگریز کو کتاب واپس کی۔ کامنی بولی۔ ''یہ گارڈنر کا جاسوسی ناول ہے۔ ان کے ناول مجھے بہت پسند ہیں۔ اس میں کا ایک کردار پیری جو وکیل ہے، سچ میں ایک چالاک آدمی ہے۔ چالاک سے چالاک خونی کو سزا دلوا دیتا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کسی خونی نے اگر پانچ خون کئے ہوتے تو وہ اس وکیل سے بچ جاتا کیوں کہ پانچ کی گنتی حقیقی اور فتح کی ضمانت ہے۔''

''پھر پانچ'' میں نے اپنے دل میں کہا اور ذہن کا رخ بدلنے کے لئے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ تبھی سامنے سے ایک اخبار والا چیختا ہوا نکل گیا۔

'' شام کے اخبار کی سب سے بڑی خبر، ایک شخص نے چار خون کر دئے، لیکن وہ پکڑا گیا۔''

''اگر پانچ کرتا تو کبھی نہ پکڑا جاتا''

میں کامنی کے چہرے کو حیرانی سے تکنے لگا، لیکن اس نے میرے چہرے پر توجہ نہ کرتے ہوئے اپنی باہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور گلے لگ کر کہا۔ ''اب چلنا چاہئے۔''

میں بھی اس کے جسم کی خوشبو میں سب کچھ بھول گیا اور اسے اپنی بانہوں میں کس کر پکڑ لیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم الگ ہو کر اپنی اپنی راہوں پر اگلے اتوار کی ملاقات کا وعدہ لئے چل پڑے۔

دوسرے دن سلطان نے مجھ سے ملتے ہوئے گلہ کیا۔ ''کیوں پیارے یہی دوستی ہے۔ دو ہفتوں سے

دیدار نہیں ہو رہے۔''

''کیا بتاؤں یار جو تو مجھے کہتا تھا نہ تو میں نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''ہاں ہاں کل میں نے تجھے کامنی کے ساتھ نشاط باغ میں دیکھا تھا یار، تبھی تو میں تجھ سے ملنے یہاں آیا ہوں، مبارک ہو تیری زندگی تو سیٹ ہوگئی، محبوبہ بھی خوبصورت ملی اور شادی کے بعد اس کی لاکھوں کی دولت کا بھی تو اکیلا وارث ہوگا۔''

''تو جانتا ہے اسے۔''

''ہاں بہت اچھی طرح۔ یہ شہر کے مشہور سیٹھ رتن لال کی اکلوتی بیٹی کامنی ہے۔ کیوں تجھے معلوم نہیں۔''

''اس نے بتایا تو نہیں خیر تو آ گیا، بہت اچھا لگا۔ چل تجھے کافی پلاتا ہوں۔''

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سلطان جب رخصت ہو گیا تو ٹیلیفون ڈائرکٹری سے سیٹھ رتن لال کے گھر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو کون؟''

''جی مجھے کامنی دیوی سے بات کرنی ہے۔''

''میں کامنی دیوی بول رہی ہوں آپ کون؟''

اور اس کے بعد میں نے دل کے سارے پھپھولے اس کے سامنے پھوڑ دئے۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتی رہی، پھر ٹھنڈے دماغ سے بولی۔''کیا میں تمہاری محبت کا امتحان نہں لے سکتی۔''

''لیکن امتحان لینے کا یہ انداز تو بہت شاطرانہ ہے۔ اپنے والدین کو مردہ قرار دینا۔۔۔۔۔۔''اس نے میری بات درمیان میں کاٹتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ چلا، وہ جو آدمی تھا نہ جس نے مجھ پر چوری کا الزام لگایا تھا، کل رات اس کا قتل ہو گیا۔''

''کیا۔؟ یہ تو بہت برا ہوا قاتل کو ضرور پکڑا جانا چاہئے۔''

''بالکل، اگر اس نے پانچ خون نہیں کیا تو ضرور پکڑا جانا چاہئے۔''

''لگتا ہے کہ تم مرتے دم تک ''پانچ'' گنتی کا پیچھا نہیں چھوڑو گی''۔

''اس کے ساتھ میری زندگی کی کہانی جڑی ہوئی ہے۔''

''لیکن وہ کہانی جو تم نے مجھے سنائی تھی، وہ تو جھوٹی نکلی؟''۔

''کوئی دوسری کہانی بھی تو ہو سکتی ہے۔''

''لیکن یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہ جھوٹی ہے یا سچی؟''میرا جاسوسی دماغ پھر کام کرنے لگا تھا۔

''دیکھتے جاؤ۔اچھا جان اتوار کو صبح پانچ بجے ملتے ہیں، پہلگام جانے کے لئے، وہیں سارا دن گزاریں گے۔'' یہ کہ کر اس نے فون رکھ دیا۔

میں سوچنے لگا، کیسی عجیب لڑکی ہے۔ایک بات صاف ہوتی ہے تو دوسری پر اسرار ہو جاتی ہے۔بہر حال اتوار کو پورا دن ہے، اس دن سارے راز کھل جائیں گے۔

دو دن بعد میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ سلطان بدحواس حالت میں میرے پاس آیا۔''تم نے آج صبح کا اخبار دیکھا۔''

''نہیں؟ جلدی میں تھا، اس لئے نہیں دیکھ سکا، سوچا دفتر میں لنچ ٹائم میں دیکھ لوں گا۔کیا بات ہے؟ اتنا گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔؟''

''ارے یار تیری کامنی نے اپنے ماں باپ اور نوکر کا خون کر دیا، لیکن پکڑی گئی اور حوالات میں ہے۔''

''کیا۔؟'' میری حیرانی کی انتہا نہ رہی، اسی وقت میں اس سے ملنے چل پڑا۔

''تو تم نے آخر تین خون کر دیا، اس لئے پکڑی گئی۔اگر پانچ کر دیتی تو بچ جاتی۔''

اس کے چہرے پر کوئی اضطراب نہ تھا۔وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

''تین نہیں چار۔اس الزام لگانے والے آدمی کو بھی میں نے ہی مارا تھا۔پانچواں نمبر تمہارا تھا۔اگر پولیس کو ثبوت نہ ملا ہوتا تو میں پہلگام کی وادیوں میں تمہارا پانچواں خون کر دیتی اور پھر اپنے باپ کی دولت پر زندگی بھر عیش کرتی۔اپنے خواب پورے کرتی۔اپنے تصور میں جیتی۔''

''کیسا خواب۔۔۔کیسا تصور۔۔۔تم نے آخر یہ سب کیوں کیا۔''

''میں امیر ترین باپ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔بچپن سے میں نے جو چاہا، اسے حاصل کیا۔میری عجیب سے عجیب خواہش بھی پانچویں کوشش میں پوری ہو جاتی تھی، میں نے سب کچھ جھوٹ سے حاصل کیا۔سچ اور حقیقت کی کوئی قدر نہیں اس دنیا میں۔لیکن ادھر حقیقت میری سب سے بڑی دشمن بن گئی۔ماں باپ میری شادی کے بارے میں سوچنے لگے جو کہ ایک حقیقت تھی، میرے بہت سے تصورات پامال ہونے لگے۔مین گھٹن محسوس کرنے لگی۔اس آدمی نے سچ کہا کہ میں نے اس کی دوکان سے بالی چرائی، اس لئے میں نے اس کا خون کر دیا۔میرے ماں باپ نے مجھے جنم دیا، میرا وجود ان کے سبب حقیقی بنا، اس لئے میں نے ان کا خوں کر دیا۔میرا بوڑھا نوکر مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتا تھا، جب کہ میں اس کی حقیقی بیٹی نہیں تھی۔لیکن اس کی بیٹی والی محبت حقیقت تھی، اس لئے میں نے اس کا خون

کر دیا۔تم مجھ سے سچی محبت کرتے تھے،اس لئے میں تمہارا خون کر کے ''پانچ'' کی گنتی پوری کر کے بچ جانا چاہتی تھی لیکن چار کے بعد ہی پکڑی گئی۔ مجھے سچ سے نفرت ہے۔۔۔حقیقت سے نفرت ہے۔''

''یہ تمہارا پاگل پن ہے۔تمہاری فطرت کی ضد نے آگے ترقی کرتے ہوئے فطری جرم کی شکل اختیار کر لی۔اگر تمہیں حقیقت سے نفرت تھی تو تمہیں اپنے حقیقی وجود کو مٹا دینا چاہئے تھا۔اپنی خونی فطرت کی تسکین کے لئے تم نے دوسروں کے وجود کو کیوں کر مٹایا۔''

یہ سن کر وہ میری طرف حیران نگاہوں سے دیکھنے لگی۔یکا یک اس نے اپنا سر بہت تیزی سے حوالات کی سلاخوں پر دے مارا۔ٹکر میں اتنی شدت تھی کہ سلاخیں ٹیڑھی ہو گئیں۔اس کے سر سے خون کی دھار بہ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔خواتین پولیس اسے اٹھا کر اسپتال کے لئے روانہ ہو گئی۔میں آہستہ قدموں سے واپس چل پڑا۔لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کیا تھی۔گنہگار۔؟ فطرت میں شامل جرم کرنے کی خواہش سے مجبور؟ مجھے اس سے نفرت کرنی چاہئے یا ہم دردی؟ یا پھر پیار جو کہ مختلف وجوہات کی بنا پر کبھی ختم نہ ہونے والی جدائی سے دو چار کر گیا تھا۔میں آج تک ایہ فیصلہ نہ کر سکا۔

☆☆☆